

احمد بن قاسم



پاکستان

فہرست

۱۱	احسان
۲۶	عورت صاحبہ
۳۵	جوتا
۴۵	اندھا
۵۹	عالان
۶۹	نیلا پھر
۷۹	بارٹر
۹۱	ایک عورت تین کھانیاں
۱۰۱	ایک احمدیانہ محنت کی کھانی

قاسم کے نام

جو میرا عزیز بھی ہے اور ہم دونوں کا موضوع فن
بھی مشترک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میسا ان
انسانہ فلیسی ہے اور اُس کا، فونڈگر ان —

گزارش

کسی بھی تخلیقی فن کار کے لئے موضوعات کبھی کمیاب نہیں ہوتے۔ اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے آس پاس موضوعات کم ہو رہے ہیں تو یہ کمی داصل خود اس کے اندر ہوتی ہے۔ میرے ساتھ الیتیہ یہ ہے کہ میں نے موضوعات کی کمی کبھی محسوس نہیں کی، مگر میرے حالات نے مجھے اتنا مصروف کر دیا ہے کہ میری افسانہ نگاری کی رفتار بہت سُست پڑ گئی ہے۔ اس سُست رفتاری کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے جیسے میری عزیز بڑھ دہی ہے، لفظ گاریں بہاہور ہاہر ہے، چنانچہ قارئین میرے اس دور کے افسانے پڑھ کر محسوس کریں گے کہ میں الفاظ کی فضول خرچی سے ممکن حد تک اجتناب کرتا ہوں اور میرے ان افسانوں میں شاید کتنی ایک لفظ بھی زاید یا فاتحہ نہیں ہے۔ یوں ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کر کے لکھنا بہت وقت طلب کام ہے۔

«کپاس کا چھوول» کی اشاعت کے بعد میں نے گل سات افسانے لکھے ہیں جو «نیلا پتھر» میں شامل ہیں۔ آخر میں دو ایسے افسانوں کو بھی شامل کر دیا ہے جو «سنٹاٹا»، «بازار حیات»، «برگ حناء»، «گھر سے گھر تک» اور «کپاس کا چھوول»، مرتب کرتے ہوئے میرے ذہن سے اُتر گئے، اور اگر ان میں سے کوئی یاد آیا، تو وہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اب تک دونوں دستیاب ہو گئے ہیں، تو انہیں «نیلا پتھر» میں شامل کر دیا ہوں۔ مُر کے اس مرحلے میں سوچنے لگا ہوں کہ جو کچھ محفوظ ہو سکتا ہے اسے محفوظ ہو جانا چاہیے۔

نیلم

۱۹۸۰ء، مارچ ۲۰

لاہور

احسان

دھوپ نشہ آور بھی، مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

اس وقت آسمان اتنا نیلا ہوا تھا جیسے اسے چھولو، تو پوری نیلی ٹپڑیں۔ سورج مشرق میں پینتالیس کے زاویتے پر تھا۔ رات کی بارش میں اینٹوں کی چھت دھل گئی بھی اور دھوپ نے اینٹوں کو صیقل سا کر دیا تھا۔ اتنی کھلی چھت پریں ایک کرسی اور ایک تپائی رکھ کر اخبار ٹپڑھنے لگا تو وہ مجھے ابھی ابھی سارا گا۔ سو میں نیچے جا کر ایک رسالہ اٹھا لایا اور تب دھوپ کو شراحت سو بھی اور میں غنودہ سا ہونے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے اپنے پھوٹے لمبی طرح لال نظر آتے۔ میں نے سوچا کتنی عجیب بات ہے کہ ہم بند انکھوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں جیسے اس وقت میں اپنے پھوٹے دیکھ رہا ہوں۔ کوشش کی جلتے تو بند پھوٹوں سے شاید اور بھی بہت کچھ دیکھا جاسکتا ہو۔

میں نے غنودگی سے جنگ کرنے کی ٹھانی۔ ابھی کچھ دیر پہنے تو میں نے ناشہ کیا تھا۔ یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے۔ یہ علم الابدان کا کوئی راز ہو گا کہ جب سرماکی دھوپ میں انسان اپنی نظریں کتاب پر یا کسی ایک نقطے پر مرکوز کر دے تو اسے نیند آنے لگتی ہے۔ نیند سے بچنے کے لئے میں رسالے کی ایک غزل لگانے لگا، مگر میری لگنا ہٹ بہت مدھم تھی۔ ممکن ہے ٹپڑس کی چھت پر خواتین میری طرح بیٹھی دھوپ سینک رہی ہوں۔ میری اور ٹپڑس کی چھت کے درمیان جو حد فاصل تھی وہ انسان کے او سط قدم سے بھی با تھ بھر

اوپنی تھی۔ پھر جہاں پر دے کے سلسلے میں اتنی اختیاط برتنی گئی ہو، وہاں بلند آواز سے
لگنا نامعیوب ہی ٹھہرے گا۔

دھپ دھپ کی آواز سے میں چڑکا۔ پہلے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اٹھ کر نیچے صحن میں
جھانکا۔ میرے گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں پلٹا تو دھپ دھپ کی ایک اور آواز آئی۔ اب میں
نے اس کی سمت معین کر لی تھی۔ یہ آواز پھتوں کی حد فاصل کی دوسری جانب سے آ رہی تھی۔
میں سمجھا بچے کھیل رہے ہیں سو دا پس اُکر کر سی پر بیٹھ گیا۔

ایک بار پھر دھپ دھپ ہوتی اور پھر ایک سوانی آواز آئی۔ ”سترنے؟“

”میں اٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا۔“ جی۔ آپ بھجو سے تو مخاطب نہیں ہیں؟“

”آپ ہی سے مخاطب ہوں۔“ آواز آئی۔ ”مجھے معلوم ہے آپ اس مکان میں دوچار
روز پہلے ہی تشریف لاتے ہیں اور آپ سے کوئی جان پہچان بھی نہیں، مگر سوچا آپ کو تکلیف
دے کر دیکھتی ہوں۔ آپ کا کوئی ملازم ہے گھر کے کام کا ج کے لئے؟“

”جی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہٹول سے کھانا کھا لیتا ہوں۔“

”اس وقت آپ کے پاس کوئی دوست نیٹھے ہوں تو ان سے کہہ دیجئے۔“

”جی نہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”اکیلا ہوں، مگر آپ کیسے تو کوئی کام نہ ہے کیا؟“

”جی ہاں۔“ آواز آئی۔ میرے اب اج پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور گھر میں صرف میں ہوں۔

دن کا وقت ہے اور میں پر دہ کرتی ہوں۔ ایک دو لاٹی ہے دکان سے۔ نسخہ میرے
پاس ہے۔ کیا آپ تکلیف کر سکیں گے؟“

”دنخوشی۔“ میں نے کہا۔ ”میں ادھر گلی میں آپ کے دروازے پر آتا ہوں۔ نسخہ

دے دیجئے تو ایک منٹ میں دو الاتا ہوں۔ دو اؤں کی دوکان تو چند قدم پر ہے۔“

”لگی کے موڑ پر۔“

”خدا آپ کا جلا کرے۔“

میں فوراً نیچے گئی میں آیا اور پردوں کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ دروازے پر پردے کے لئے ایک پُرانا پنگ پوش آبیزان تھا۔ اپنی موجودگی کا بتانے کے لئے میں کھنکا را تو دبی آواز آئی۔ ”اچھا آپ تشریف لے آتے! یہ سمجھتے“

ایک ہاتھ لٹکی ہوئی چادر کے ایک طرف سے نکلا۔ سافول۔ سافولا اور تازہ تازہ سا جیسے ابھی دھل کر نکلا ہے۔ ہاتھ چاہے میلہ ہو چاہے صاف، سافولا ہو چاہے سفید، انسان کی عمر بتاویا ہے۔ لوگ عمروں کے اندازے کے لئے خواہ نخواہ چہروں کو گھوڑتے رہ جاتے ہیں۔ ہاتھ انسانی عمر کا سچا غماز ہوتا ہے۔ وہ کمپیوٹر کی سی سخت کے ساتھ انسانی عمر کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس سافولے اور تازہ ہاتھ والی کی عمر میں بائیس برس کے آس پاس ہو گی۔ میں نے اس ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت کی پوروں کے درمیان تھما ہوا نسخہ اور ایک روپے کا نوٹ لے لیا اور کہا! ”میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“

”جی شکر یہ آواز کو شوری طور پر دبا کر سرگوشی بنادیا گیا تھا۔“

عام سی دو اتحتی میں دو گولیاں لے کر فوراً پلٹا اور ایک بار پھر دروازے پر کھنکا را۔ ”ارسے! اتنی جلدی!“ ہاتھ چادر کے ایک طرف سے باہر آیا۔ ”خدا آپ کا بھلا کرے آپ نے بڑا احسان کیا ہے؟“

”احسان!“ میں نے جیرت سے کہا اور گولیاں نسخے سمیت تھیلی پر کھدیں۔ ”احسان کا وزن تو بہت بھاری ہوتا ہے بی بی۔ ان دو گولیوں کا وزن تو احسان کے وزن کے پاسنگ بھی نہیں۔“

”جی میں گولیوں کے وزن کی بات نہیں کر رہی ہوں۔“ آواز آئی۔ ”ایک اجنبی کے لئے چھت سے اترنے، یہاں آنے اور دو لانے کا اپنا ایک وزن ہے۔ آپ نے احسان کیا ہے اس لئے وزن کو محکوس نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے احسان لیا ہے اس لئے بیری گدن احسان کے بارے سے جھگی ہوئی ہے۔ بہت بہت شکر یہ۔“

چر بھے اس کے جانے کی آواز آئی اور میں نے اپنے گھر کی چھت پر آکر رسالہ کھول لیا، مگر وہاں سب لوگ حیات و کائنات کے مسائل سمجھنے میں لگے ہوتے تھے۔ میری دشکیری کو ان کرتا۔ میں نے رسالہ میز پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور پوٹوں کی ہو ہو سرخی کے پار دیکھنے لگا جہاں سے ایک ہاتھا چلکی میں کاغذ کا ایک پر زہ لتے، ابھرا اور چھڑی سے ہو ہو ہو کر سرخی میں تخلیل ہو گیا۔ ایک بار چھرا بھرا، چھر تخلیل ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ چھوٹی بات! میں نے سوچا۔ مجھے لڑکی کا ہاتھ نظر آ رہا ہے مگر اس کا فائع زدہ باپ کھاتی نہیں دے رہا ہے جس کے لیے دلالانے والا ہی کوئی نہیں۔

میں رسالے کو بغل میں مار کر نیچے گھرے میں آگیا، ہر شے ٹھٹھری ہوئی تھی مگر خود میں کتنا تپ رہا تھا۔ ہم مشرقی لوگ بھی عجیب ہونق لوگ ہیں۔ اپنے لئے اتنے نلک بوس اخلاقی قلعے تعمیر کرتے ہیں اور پھر تاک میں بیٹھ جاتے ہیں کہ قلعے کی دیوار پھٹے تو باہر کے منظر کی کوئی جھڈک نظر آتے ہم خود ہی اپنی آنکھوں کو انداھا کر کے غُر بھرا پنے انہیں پن کا علاج ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

شام کو میں گھر سے نکلا تو چار قدم پر ہی ٹروس کا وہ دروازہ تھا جس پر ایک پُرانا پنگ پوش نلک رہا تھا سوچا، لڑکی کے آبا کی مزاج پر سی کر لینی چاہئے۔ ٹروسیوں کے تو ایک دوسرے پر بہت حقوق ہوتے ہیں۔ میں نے بڑھ کر دروازے پر ہلکی سی دشکش فٹے ای۔

”کون؟“ دُور سے لڑکی کی آواز آئی۔

”جی میں۔ آپ کا ٹروسی؟“ میں نے کہا۔ اب آپ کے آباجی کے مزاج کیسے ہیں؟“

”اچھا تو آپ ہیں!“ اس کی آواز میں اطمینان تھا۔ میں اور چھت کی دیوار پر بہت دیر تک دھپ دھپ کرتی رہی۔ چھر سوچا آپ کہیں چلے گئے ہیں؟“

”جی میں تو نیچے گھرے میں تھا،“ میں نے کہا۔ ”آپ میرا دروازہ کھٹکھٹا دیتے ہیں؟“

”وہ بولی؟“ اس کے لئے مجھے دن کو گلی میں جانا پڑتا اور میں عرض کر چکی ہوں کہ میں

پر دہ کرتی ہوں۔“

”بھی“ میں مستکے کی نزاکت کو سمجھ گیا۔

وہ کہنے لگی۔ ”اب یہ بھی اچھا نہیں مگر رہا ہے کہ آپ گی میں میرے دروازے پر کھڑے ہیں اور میں پر دے کے پیچھے سے آپ سے باقیں کر رہی ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ ہمارے وگن پرے کو ابنا نے کے فن میں بڑے ماہر ہوتے ہیں؟“
یکایک مجھے اکٹھا بہت سا احسان جرم ہوا۔ میں نے ایک قدم ہٹ کر کہا: ”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں چلتا ہوں۔ میں تو صرف مزانج پُرسی۔“

”مگر آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں آپ کو کیوں بلا رہی تھی؟“ اس نے لکھتے ہوئے پنگ پوش کا ایک کنارا ہاتھ میں لے لیا۔ کمپیوٹر چلنے لگا۔

”بھی، بھی“ میں نے کہا۔ ”فرمایتے۔ میرے لائی کوئی خدمت؟“

”ڈاکٹر کو بلانا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اب آجی کی حالت ویسی ہی ہے اور پہاڑ جیسی رات آئے والی ہے۔ میں کل شام کے اندر ہیرے میں بر قعہ اور ڈھکر ڈاکٹر عبدالقدوس کو بلا لائی تھی۔ انہی کو پھر بلانا ہے۔ قریب ہی ہیں۔ آپ کو تکلیف ہو گئی مگر کیا کروں۔ اب آجی کو تنہا چھوڑتے ہوتے ڈرتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب فوراً آ جائیں گے۔ آباجی سے ان کی جان پہچان ہے۔“

”ابھی لاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے ان کے کلینک کا بورڈ لکھا ہے۔“
ڈاکٹر صاحب ایک معسرہ اور نحیف وزار بزرگ تھے۔ وہ نسخہ لکھ رہے تھے اور ایک تنومند مریض ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ مریض دراصل ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر صاحب دراصل مریض ہیں۔ میں نے جا کر عرض کیا تو فوراً نسخہ مریض کے حوالے کیا، سیٹھکوپ اٹھا کر میرے ساتھ چل پڑے۔

میں نے جا کر دستک دی اور ساتھی کہا: ”ڈاکٹر صاحب تشریف لے آتے

یہیں۔“

”جی اچھا یہ دُور سے آواز آئی۔ پھر پنگ پوش پُورے کا پُورا اٹھ گیا۔ لڑکی پوری کی پوری میرے سامنے کھڑی تھی۔

میں سمجھا اس نے بدحواسی میں پردہ اٹھا دیا تھا، چنانچہ میں گھبرا کر چیخے ہٹا تو وہ بولی مکونی بات نہیں۔ آپ بھی آ جائیے۔ میں نے آباجی کو بتا دیا ہے۔“ پھر وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف بڑھی۔ ”آباجی سن بھی رہے ہیں؟ دیکھ بھی رہے ہیں۔ بس بول نہیں سکتے۔“ اور جب وہ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی تو میرے دل نے گواہی دی کہ کپی یورٹ کا اعلان حرف بہ حرف، نقطہ بن نقطہ درست تھا۔

یہ گھر بالکل میرے گھر کے مشاہد تھا۔ گلی میں کھلنے والا دروازہ دراصل پہنے کمرے کا دروازہ تھا۔ دوسرا کمرہ مخفی تھا۔ بغل میں باورچی خانہ اور کائنات ختم۔ اگر حیوانات اشرف المخلومات ہوتے اور انسانوں کو پالتو جانوروں کی طرح رکھتے تو ان کے لئے ایسے ہی ڈربے بناتے۔

ڈاکٹر صاحب اور لڑکی تو دوسرے کمرے میں چلے گئے اور میں کھڑا یہ سوچتا رہ گیا کہ ایک ہی دن میں ایک جوان پردہ نشین کا یوں بے تہکفی سے سامنے آ جانا ضرور تا بھی ہو سکتا ہے اور مجبوراً بھی۔ ضرور تا یوں کہ باپ کی بیماری میں کام آنے والا کوئی تو ہونا چاہیئے اور مجبوراً یوں کہ۔۔۔ آخر بھی کے سینے میں دل ہوتا ہے اور باپ بیمار بھی پڑا ہو تو دل کے احکام ٹالے نہیں جاسکتے۔

”آپ تو باہر کھڑے رہ گئے۔“ لڑکی دوسرے کمرے کے دروازے میں نمودار ہوتی۔ ”اپنوں سے کیا پردہ۔ آ جائیئے نا!“

ایک کونڈے کی طرح یہ فیصلہ میرے دل و دماغ میں پک گیا کہ معاملہ ضرورت کا نہیں ہے، مجبوری کا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس ایک لمبے میں میرا قد ایک آدھ انجی

ضرد بر بڑھ گیا ہو گا۔

لڑکی کے آبا جی خاصے وجہیہ، مگر بے حد کمزور بزرگ تھے۔ چھوٹی سی آہی سفید آہی سیاہ ڈاڑھی تھی۔ مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں نے ان کے ہونٹوں کے فرالض انجام دیتے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی یہ مسکراہٹ نظر آگئی۔ بولے۔ ”صیبحہ بیٹی۔ قریشی صاحب اس فوجوان کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔“ میں سمجھا صیبحہ جھینپے گی مگر وہ بظاہر ذرا سی بھی تو نہیں جھینپی۔ صرف اتنا بولی۔ ”میں آبا جی کو بتا پکی ہوں کہ ہمارے یہ چڑو سی صاحب بڑا درد مند دل رکھتے ہیں۔“

اب تو میں صبح و شام ذرا سی دستک دے کر پرداہ اٹھاتا اور اندر چلا جاتا۔ میں قریشی صاحب کی دوا کے علاوہ ان کے گھر کا سودا بھی لانے لگا۔ ایک دن صیبحوں نے مجھ سے بال پنیں تک منگوایں، البتہ بات چیت تکلیف معاف، اور ”آپ نے بڑا حسان کیا ہے“ سے آگے نہ بڑھی۔ صیبحوں نے مجھے دیکھتے ہی بہت فراغدی سے مسکراتی تھی اور مجھے کام پر روانہ کر دیتی تھی اور رات کو جب میں بستر پر لیٹتا تھا تو اس کی ایک ایک حرکت کا بہت بھر انفسیاتی تجزیہ کرتا تھا۔ سودے کے لئے رقم دیتے ہوئے اس کی پوریں میرے ہاتھ سے یوں ہی تو نہیں چھوگئی تھیں۔ پرسوں شام کو وہ میرے سامنے دو پٹے کے بغیر لوں ہی تو نہیں آگئی تھی۔ مجھے جو اس نے کھاتھا کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں مُل جاتی تو اتنی باعثی بات اس نے یوں ہی تو نہیں کہ ڈالی تھی۔ نہیں، میں اُسے رُلنے نہیں دُوں گا۔ ایسی ہیرا لڑکیاں رُلنے کے لائق نہیں ہوتیں۔

ایک رات میں نے طے کیا کہ اب انہار میں تاخیر نہیں کرنی چاہیتے۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھو ہیجھے کہ مجھیں جراثت کی کی ہے، چنانچہ صبح کو سودا لا کر دینے کے بعد میں گھر آیا تو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر انہار کی مشق کرتا رہا۔ پھر باہر گلی میں جانے کے لئے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو اس مقفلے میں پہلی بار محسوس ہوا کہ صیبحہ کے دروازے پر

دستک دینے کے لئے شیر کا کلیجہ چاہئے۔

اور ابھی میں اپنے مر جھاتے ہوئے حوصلے کو تازہ دم کرنے کے مرحلے میں تھا کہ وہ میرے سامنے آگئی۔ اولیں صاحب اذرا جلدی سے آ جائیتے، پھر فوراً ہی وہ مشین کی طرح پلٹ گئی۔

میں باہر لپکا۔ پردہ اٹھا کر اندر گیا تو وہ دوسرے کرے میں تھی۔ میں سیدھا دہان پہنچا تو وہ اپنے آباجی پر جھکی پچھے سے انہیں پانی پلا رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو بولی: "آباجی ہوش ہو گئے تھے۔ میں نے گھبرا کر آپ کو بلا لیا۔ اب ٹھیک ہیں۔" پھر قریشی صاحب پر جھک کر پوچھا: "آباجی، اب آپ ٹھیک ہیں نا؟"

قریشی صاحب کے تیور اگرچہ منجمد تھے۔ مگر ان کے چہرے کے کسی نہ کسی حصے سے اس جواب کا تاثر مل رہا تھا کہ — ٹھیک ہوں بیٹھی۔

بڑی اختیاط سے گردن تک لمحات اور ڈھا کر وہ بولی: "چاٹے پہیں گے نا آباجی۔" پھر جیسے اس نے جواب سُن لیا ہو۔ بسوار کر بولی: "میں رو نے بیٹھ جاؤں گی یہیں آپ کے سینے سے لگ کر۔ یہ اولیں صاحب بھی مجھے چھپ نہیں کر سکیں گے۔ ہاں — لااؤ چاٹے ہے،" پھر وہ خوش ہو کر سیدھی ہو گئی اور مجھ سے کہنے لگی: "آباجی راضی ہو گئے ہیں۔" کمرے سے باہر نکلی تو میں بھی ساختہ ہی چلا آیا۔ مجھے ایک موڑھے پر بیٹھنے کو کہا تو میں نے انکار کر دیا۔ "چاٹے میں بناؤں گا۔" میں نے کہا۔

وہ کھڑی سوچتی رہ گئی۔ پھر مسکراتی اور بولی: "آئیئے۔ مل کر بناتے لیتے ہیں۔" میرے باورچی خانے کا سا باورچی خانا تھا، چنانچہ ایک بار تو میں سمجھا وہ میرے گھر میں ہے اور میرے لئے چلتے بنارہی ہے۔ انہمار کے لئے یہ مناسب ترین وقت تھا —

مگر کیا یہ مناسب ترین وقت تھا؟

کیتنی کوچھ لٹھے پر دکھ کر وہ بولی: "آج آپ اتنے چُپ کیوں ہیں اولیں صاحب؟"

”چپ ہے“ میں نے پوچھا۔ ”کون ہے میں؟ مگر میں ایسا باتوں کب تھا صبیحہ صاحبہ؟“
ایک دم مجھے احساس ہوا کہ اگر میں ”صبیحہ“ کے ساتھ ”صاحبہ“ کا لاحقہ نہ لگاتا تو
آدھا انٹھار تو یوں ہی ہو جاتا۔

”میں نے کہ کہا کہ آپ باتوں ہیں۔“ صبیحہ پیالیاں دھوتے ہوئے بولی۔ ”بس آپ
مجھے کھوتے کھوتے سے لگے اس لئے پوچھ لیا اور اس لئے بھی پوچھ لیا کہ کھویا کھویا تو
مجھے لگنا چاہتے ہیں؟“

یہ بھی انٹھار کا ایک پہلو ہے، میں نے سوچا۔ اب دو گرم تھا۔ میں نے ضرب لگانے
کا فیصلہ کر لیا۔ ”بات یہ ہے صبیحہ۔“ ”صاحبہ“ کہنے سے پہلے میں نے حلتوں میں الٹکا
ہوا کا گولانگھنا چاہا، کہ ادھر سے قرضی صاحب کی بہت لمبی کھانسی کی آواز آئی اور صبیحہ
گولی کی طرح باورچی خانے سے نکل گئی۔ میں نے اس دوران میں چاٹے تیار کر لی۔ دودھ
گرم کر لیا۔ ایک پُرانے گھسے ہوئے طشت میں سب چیزیں سجا ہیں تو وہ واپس آئی۔
”ارے!“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”آپ تو رُکیوں کی طرح سلیقہ مند ہیں۔“

رُکیوں کی طرح!۔ میں نے ناگواری سے سوچا۔ پھر کہا۔ ”سلیقہ مند ہی پر صرف
رُکیوں کا اجھارہ تو نہیں صبیحہ صاحبہ۔“ ناگواری کی وجہ سے میں صاحبہ کے لفظ کو
رد ک نہ سکا۔

”میں نے آپ کی صنف پر تو حمد نہیں کیا اور میں صاحب“ وہ بولی۔ ”ویسے یہ تو
آپ نہیں گے کہ سلیقہ مند ہیں فوکیت لڑکی ہی کو حاصل ہے۔“ پھر طشت اٹھا کر
بولی۔ ”آئیے۔ آپ ادھر کمرے میں تشریف رکھیں۔ میں آباجی کو چاٹے پا کر حاضر ہوتی
ہوں۔ آئیتے۔“

میں اس کے تیچھے اسی کمرے میں آیا جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا اور جس پر
پُرانا پنگ پوش لٹک رہا تھا۔ مجھے ایک مرند ہے پر بٹھا کر اس نے چار پانی پر ٹپی

ہوتی ایک کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ ”جب تک آپ یہ کتاب دیکھتے،“
یہ ٹانسٹائیکی ”اینا کر پیندا،“ تھی۔ میں نے اسے پڑھ رکھا تھا اس لئے پرلی طرف
ایک ٹوٹی ہوتی کوسی پر پڑی ہوتی کتابوں کے پاس گیا۔ سب سے اوپر اینڈرا پاؤ نڈ کی
نظموں کا مجھ مدد کھاتھا۔ اس کے نیچے پاسترنک کی روشنی نظموں کے انگریزی ترجمہ کی کتاب
تھی۔ پھر بیدی کاظمیل افسانہ ”اک چادر میلی سی“ — نہ کوئی ڈا جسٹ، نہ کوئی نیوز ویک
نہ کوئی اسٹریڈ ویکلی! خاصی بقراطار کی معلوم ہوتی ہے!

”آج مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے،“ وہ اسی مونڈھے پر اکر بیٹھ
گئی جس پر مجھے بٹھا گئی تھی۔ پھر وہ اچانک اٹھا کھڑی ہوتی۔ ”میرے خیال میں آپ مونڈھے
پر بیٹھیں۔ میں چار پانی پر بیٹھتی ہوں،“ وہ چار پانی پر بیٹھ گئی، مگر پھر فوراً اٹھا کھڑی ہوتی اور
دوسرے گردے کی طرف بڑھی۔ ”میں چاٹے تو وہیں چھوڑ آئی!“

جب تک وہ طشت لے کر واپس آئی، میں مونڈھے پر بیٹھ چکا تھا۔ بیٹھنے کے باوجود
مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کھڑا ہوں۔ آج اسے مجھ سے ایک ضروری بات کہنی ہے نا۔
اور میں جانتا ہوں اس عمر میں ضروری بات کیا ہوتی ہے مگر کیا یہ ضروری بات کہنے میں پہل
مجھے نہیں کرنی چاہتے۔ — بہر حال دیکھتے ہیں۔ — دیکھتے ہیں۔

اس نے چاٹے بن کر پیالی میرے ہاتھ میں تھامی اور بالکل میرے سامنے چار پانی پر
بیٹھ گئی۔ ”اویں صاحب“ وہ بولی۔ اس کی آواز میں ایک ایسی سکپی تھی جو چھپا تی جا رہی تھی
مگر چھپنے میں رہی تھی۔ ”اویں صاحب“ ہیں نے آج ابھی اپنی زندگی کے بارے میں ایک فیصلہ کیا ہے؟
مگر فیصلہ تو میں نے بھی کر رکھا ہے، میں نے سوچا۔

”اویں صاحب“ وہ چار پانی کو ذرا سا گھسیٹ کر میرے اور قریب آگئی۔ میں
دنیا کی شاید واحد لڑکی ہوں جس کی سیلی ایک مرد ہے اور وہ آپ ہیں؟
یہ جملہ کہہ کر صحیح مجھ پر بہقت لے گئی تھی۔ اس نے یہ پرانا صفر و صدہ غلط ثابت کر

دیا تھا کہ عورت چاہے ہزار جان سے مرد پر فریفته ہو، محبت کا انظمار ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔

”اویس صاحب؟ اب اس کی آنکھیں ڈپٹیا رہی تھیں۔“ میں دو بھائیوں کی ایک ہی بہن ہوں مگر میرے یہ دونوں بھائی روپے کی تلاش میں اوھرا بولٹھی اور دوبی کی طرف نکل گئے اور دولت کے نشے میں ایسے ڈوبے کہ اس گھر سے بھی ہمیشہ کے لئے نکل بھاگے۔ اتنی کا انتقال ہوا اور آباجی نے انہیں اس حادثے کا تاریخ جھوپایا تو دونوں کی طرف سے ایک ہی جوانی تاریخ اجور صرف ایک لفظ پر مشتمل تھا۔ — ”سو ریا!“ —

”سو ریا!“ آپ جانتے ہیں کہ ”افسوس ہے“ کی انگریزی ہے۔ آباجی ہر روز اٹھ کر اور ہر روز سونے سے پہلے مجھ سے پوچھتے تھے کہ صابی، تمارے ان بھائیوں کو کس پر افسوس ہے؟ اپنی ماں کی موت پر افسوس ہے یاد کہنا چاہتے ہیں کہ افسوس ہم اتنے بڑے حادثے پر بھی اپنی دولت کی مشینیں روکنے سے اور پاکستان آنے سے قاصر ہیں۔ میرے یہ دونوں بھائی مجھ سے بڑے ہیں۔ شروع مشروع میں خط لکھتے رہے۔ پھر وہیں شادیاں کریں اور خط بند کر دیئے۔ اب کسی آتے جاتے کے ہاتھ سلام دعا بھجوادیتے ہیں۔ ابھی دو ہفتے پہلے میں نے ایک تیسع بھی تھی جس سے بہتر تیسع میں یہیں اپنے شرکے بازار سے دور روپے میں خرید لکھی ہوں۔ سو اویس صاحب، میں ان بھائیوں کی بہن ہوں اور یاد رکھئے یہ میرے سکے بھائی ہیں مگر دولت تو سگوں کو بھی سوتیلا بنادیتی ہے۔“

صہیہ نے روپے کے پوے سے آنکھیں پونچھیں اور بولی۔ ”معاف کیجئے گا۔ میں روئے والی لڑکی نہیں ہوں مگر کبھی کبھی آنسو زبردستی اپنے بہنے کا جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے کہ اسے رونا کیوں آ رہا ہے اور جب تک وہ کسی نتیجے پر پہنچے، آنسو اپنا کام کر چکے ہوتے ہیں۔ آپ بور تو نہیں ہو گئے؟“

”جی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”البتہ پریشان ہو گیا ہوں۔“

”میں بات کو مختصر کرتی ہوں،“ وہ بولی۔ ”یہ باتیں جو میں آپ سے کر رہی ہوں مجھے اپنی اتنی سے کرنی چاہئیے تھیں مگر وہ پہن نہیں۔ اب اسے کرنی چاہئیے تھیں مگر وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بھائیوں کا احوال آپ نے سُن لیا۔ اسی لئے تو میں نے ایک پڑوسی نوجوان کو اپنی سہیلی کہا ہے کہ میں اس بھری دنیا میں آپ کے سوا کسی سے یہ بات کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرا بھرم رکھیں گے اور مجھے شرمندہ نہیں کریں گے۔“

”آپ کسی باتیں کر رہی ہیں صبیحہ صاحبہ؟“ میں نے احتجاج کیا۔ ”میں اور آپ کا بھرم نہیں رکھوں گا؛ میں اور آپ کو شرمندہ کروں گا!— میں جو آپ کے —
جو آپ کے ایک —“ پھر میں نے سوچا کہ اس صورت حال میں میری طرف سے اطمینان مناسب نہیں ہو گا۔ پھر سہی۔ شام کو سہی۔

”میرے آبا بہت غریب آدمی تھے،“ صبیحہ بولی۔ ”نخنی سے میاری کی دو کان کرتے تھے۔ یہی سوئی، دھاگہ، ٹین، کلکھی، بال پنیں وغیرہ بیچتے تھے۔ ان کا ایک کھوکھا تھا۔ شام کو گھر آتے تھے تو اپنا سارا آٹاٹھٹھری میں باندھ کر لے آتے تھے مگر آفرین ہے ان کی استقامت پر اور اتنی کی ہمت پر کہ پیسہ پیسہ جمع کرتے رہے اور ہم تینوں کو پڑھاتے رہے۔ بھائیوں میں سے ایک نے ایف اے کیا اور ایک نے میٹرک اور پھر ٹپڑیا کے پتوں کے پر نکل آتے اور وہ دوسرے نگردن کو چل دیتے۔ اس وقت میں آٹھویں میں نہیں۔ اب سارا لاؤ پیار، سارا پیسہ مجھ پر خرچ ہونے لگا مگر میں بھگٹھی نہیں۔ میں نے میٹرک کیا، پھر ایف اے کیا، انھی دنوں اتنی چل بیس۔ اس کے بعد میں نے بی۔ اے کیا اور ایم۔ اے میں داخل بھی لے لیا مگر پھر اباجی پر فالج کے جملے ہونے لگے۔ دو چار دن ان کا ایک بازو اور ایک انگ سُن رہتے مگر پھر علنے پھرنے لگتے، تب میں کالج چلی جاتی مگر ایک آدھ دن کے بعد ان پر پھر حملہ ہو جاتا۔ آدمی رُک گئی۔ میرا کالج جانا بند ہو گیا اور اب کے تو اب کی زبان

ہی بند ہو گئی ہے۔ آج ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ اب ان کا صحبت یا بہنزا منکل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میرے منہ میں خاک، آج کل پرسوں تک چل بسیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ دو تین چار سال تک زندہ رہیں مگر وہ اسی حالت میں زندہ رہیں گے۔ مفلوج حالت میں۔

صبیحہ نے شوری طور پر آنسو پیسے اور پھر گلا صاف کر کے بولی۔ ”یہ سب پس منظر تھا اس بات کا، جو مجھے آپ سے کہنی ہے۔ اگر میں براہ راست کہہ دیتی تو آپ مجھے بے حیا رسمحتے۔ بات یہ ہے کہ ابھی محلے میں یہ بات زیادہ نہیں پھیلی ہے کہ کھو کھے میں غیاری کی دکان کرنے والا قریشی مفلوج ہو چکا ہے جس روز سارے محلے کو یہ بات معلوم ہو گی، میں ایک ایسی لڑکی بن کر رہ جاؤں گی جو رات کے اندر میرے میں مرٹک پر سے گزرتے ہوتے، غنڈوں کے زغے میں آجائی ہے۔ میرے گھر میں پھر وہ پر لپٹے ہوتے مجنت نہیں گئے۔ میرے گھر کے دروازے پر لوگ، مجھ پر آوازے کیسیں گے کتنی عجیب بات ہے کہ ایک شخص اس گھر میں زندہ موجود ہے مگر میں اس گھر میں اکیلی رہ گئی ہوں اور ہمارا معاشرہ جو اپنے آپ کو ہرامقدس کہتا ہے، اکیلی عبے آمرا لڑکی پر یوں جھپٹتا ہے جیسے کہ ہردار پر جھپٹتے ہیں۔ سو میں نے فیصلہ کیا ہے اولیں صاحب، کہ مجھے فوراً شادی کر لینی چاہیئے۔“

”درست فیصلہ ہے۔ بالکل درست فیصلہ۔“ میں نے صبیحہ کی بھروسہ تائید کی اور تائید کرتے ہوئے میری آواز اتنی بدل گئی کہ خود میں نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا۔

”خدا آپ کا بحدا کرے،“ صبیحہ نے اطمینان کی سانس لی۔ ”مجھے غلط مت سمجھیئے گا۔ مجھے ایک بگران ہاتھ چاہیئے۔ میں نوٹ کامال نہیں بننا چاہتی۔ میرے بھائی مجھے اگر اس درندہ معاشرے کے آگے ڈال گئے ہیں، تو اس کا یہ طلب نہیں کہ میں اس درندے کا شکار ہو جاؤں۔ میں اس درندے کے پھیلے ہوئے نوکیلے پنجوں کی زدے سے باہر بھی تو جا

سکتی ہوں۔ میں شادی بھی تو کر سکتی ہوں۔“
”یقیناً۔ یقیناً۔“ میں نے تائید مزید کی۔

”مجھے بس اتنی بات آپ سے کہنی تھی کہ کوئی اچھا سار شتر نظر میں رکھتے۔ اچھا سے میرا مطلب شریف آدمی سے ہے جو محبت کر سکتا ہو۔ قربانی دے سکتا ہو۔ لاپچی نہ ہو، تنگ طرف نہ ہو۔ دنیا کی خوبصورتیوں سے پیار کر سکتا ہو، دنیا کی بد صورتیوں سے نفرت کر سکتا ہو اور اس نفرت کا اظہار کر سکتا ہو۔ مجھے کوئی دولت مند انسان نہیں چاہیئے، صرف انسان چاہیئے جو غیر معمولی نہ ہو۔ عام سماں ہو، جیسے میں ہوں۔۔۔ جیسے آپ یہیں۔“

اب اظہار کامل ہو گیا تھا۔ اب مجھے مزید تفصیل پوچھنے کی کیا ضرورت تھی میں منڈھے پڑھا ہوا کمرے میں تیرتا پھرتا تھا۔ ایک بار جی چاہا بڑھ کر صبیحہ کو سینے سے لگاؤں اور اسے بتاؤں کہ تم نے میرے دل کی بات کہہ دی اور کسی نے سچ کہا تھا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

میں اٹھ کھڑا ہتو۔ دراصل میں نے طکریا تھا کہ شام تک اسے یہ بتانے آؤں گا کہ میں نے تمہارے لئے رشتہ دھونڈ لیا ہے۔ لڑکا تمہارے معیاروں کے عین مطابق ہے اور لڑکے کا نام اویس ہے اور وہ تمہارے پڑوس میں رہتا ہے۔

ویسے مجھے صبیحہ کی ذہانت پر حیرت ہو رہی تھی کہ اظہار محبت کا یہ بالواسطہ طریقہ آج تک اور کسے سوچتا ہو گا۔

”ایک رشتہ میری نظر میں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شام تک آپ کو بتا سکوں گا۔“

”صبیحہ کھل اٹھی۔“ یہ بڑا احسان ہو گا آپ کا۔“

”احسان کا ہے کا صبیحہ۔“ میں صبیحہ سے تعارف کے بعد پہلی بار اسے مخاطب کرتے ہوئے ”صبا جہہ“ کا لاحظہ گول کر گیا تھا اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔ اب

تو معاملہ صاف تھا۔

میں لکھے ہوئے پنگ پوش تک پہنچا تو وہ بولی۔ ”اویس صاحب۔ سنئے؟“ میں رُک گیا۔ ”کیتے؟“

وہ میرے بہت قریب آگئی اور بولی ”عمر کا خاص خیال رکھتے گا۔ سکون اور صفائی سے زندگی گزارنے کے لئے زندگی کا تجربہ بت فروی ہے۔ میں ایکس بائیس برس کی ہوں۔ اسے کم از کم اکتیس بیس برس کا ضرور ہونا چاہتے ہیں۔ میری آپ کی عمر کے راستے کے عام طور پر بہت انتھلے ہوتے ہیں۔ ناتجربہ کار، نمائشی سے، لونڈے سے، سمجھو گئے نا آپ ہے؟“

میں نے دیوار کا سہارا لے کر سماں ہیں پند کر لیں۔ پھر سورج جیسے چھت کو توڑ کر میرے سر پر اتر گیا۔ سارا منظر ہو گیا۔ اور وہ اس نوکے سیلا ب کو عبور کرتی ہوئی دوسرے کرے میں تحلیل ہو گئی تھی۔

۱۹۶۹ء

عورت صاحبہ

جب دوسروں کو نشہ ہوتا تھا تو کسی پر دُنیا کی بے ثباتی کی وجہ سے وقت طاری ہو جاتی، کوئی حاضر اور غائب لوگوں پر گالیوں کا طومار باندھ دیتا، کوئی استغراق میں علاجاتا اور کوئی قریب بیٹھے ہوئے مرد یا عورت کے کندھے پر سر رکھ کر سو جاتا، مگر امتیاز کے آٹھ ہونے کا اعلان اس وقت ہوتا تھا جب وہ اٹھتا اور لڑکھڑاتا ہوا یوں چلنے لگتا کہ اس کے پاؤں کا رُخ کسی طرف ہوتا اور چہرے کا رُخ کسی طرف۔ یوں وہ میزدہ تپائیوں کو والٹتا، بو تلیں اور گلاس توڑتا کیس سے کیسیں جاگرتا۔

لب کے نمبر کرنے تھے کہ امتیاز نہایت مہذب اور لکھر دُجوان ہے۔ چھر دُہ کاروبار میں مہارت کے معلمے میں اپنے والد سیٹھ نواز احمدجی سے بھی دو ماخذ آگئے ہے۔ اسے سب کچھ آتا ہے، صرف گزنا نہیں آتا اور وہ ٹھیک کرنے تھے۔ امتیاز یوں گرتا ہے آسمان گرا ہو۔ وہ بیان سے وہاں تک گرتا چلا جاتا اور ساتھ ساتھ پکارتا جاتا۔ «عورت! اے عورت! اے عورت صاحبہ!»

تب دیڑ بہر جا کر سیٹھ صاحب کے ڈرائیور کو بلا لاتا اور امتیاز کو کار میں ڈال کر گھر پہنچا دیا جاتا۔

حب امتیاز یورپ سے واپس آیا تھا تو لب میں آٹھ ہونے کے بعد اس نے

پورے کلب میں کھلبی ڈال دی تھی۔ جس پہلی عورت پر اس کی نظر پڑی تھی وہ کلب کے ایک سینٹر نمبر اجed صاحب کی بیوی تھی۔ وہ جیسے ایک طسم میں آگرا اس پر بھپٹا تھا اور اس ہنگلے میں کلب کی بہت سی کراکری ٹوٹ گئی تھی۔

دوسرے روز کلب کے سینٹر نمبر سیٹھ صاحب کے پیلس میں حاضر ہوئے تو انہی بہت سی کاروں میں اتنے بحوم کو دیکھ کر سیٹھ صاحب کی بیگم اور بیٹھی حیرت زدہ ہو کر برآمدے میں آگئی تھیں مگر اجed صاحب کے سمجھانے پر کہ یہ سیٹھ صاحب کا اور ہمارا پرائیویٹ معلمہ ہے، واپس چلی گئی تھیں۔

عام مکاؤں کے رقبے سے بھی بڑے ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر نمبروں نے سیٹھ صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ امتیاز کی فور آشادی کر دیں کیونکہ وہ "عورت عورت" پہکاتا چھڑتا ہے۔

سیٹھ صاحب ہنسنے لگے "اچھی بات ہے۔ عورت کی طلب بہت زیادہ ہو تو شادی کا میاب رہتی ہے۔ اس طلب کو ابھی ذرا سا بڑھنے دیجئے۔" سب نمبروں نے خواص باختہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ چھر ایک نمبر بولا: "تو آپ فی الحال اپنے صاحزادے کو سمجھا دتے ہیں؟"

سیٹھ صاحب ہنسنے لگے۔ چھربولے "سمجاوں؟ یعنی آپ سب ماشر اللہ پینے والے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں پہنچنے والے کو سمجھاؤں! بھتی نہ تو سمجھو جھکی بالوں کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ اس لئے میں آپ لوگوں کی نفیات اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سیٹھ صاحب" اجed صاحب بولے "مگر ہم سب ماوں، بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں والے ہیں اور ہماری نفیات کا ایک حصہ ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ یہ غیرت کی نفیات ہے۔ آٹھ ہو جانے کے بعد بھی ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی

ہمارے دومن فوک پر دست درازی کرے؟“

”دست درازی!“ سیٹھ صاحب سمجھیدہ ہو گئے۔ ”یہ تو بہت سخت لفظ ہے ماجد صاحب۔ امتیاز عورتوں سے آزادی کے ساتھ گپ لڑا سکتا ہے مگر دست درازی! یہ ناممکن ہے۔ آخر وہ میرا بیٹا ہے۔ اس کی رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے تشریف خون“

ماجد صاحب نے بھی اسی سمجھیدگی سے عرض کیا: ”سیٹھ صاحب، خون چاہے شریف ہو سکن جب گرم ہو کر اہلنا ہے تو ترافت کے سارے جائز مر جاتے ہیں اور یہ پچ سے ایک وحشی نخل آتا ہے — ڈریکولا!“

”اچھا تو آپ امتیاز کو وحشی اور ڈریکولا کہہ رہے ہیں؟“ سیٹھ صاحب کو غصہ آگیا۔

”بھی نہیں سیٹھ صاحب“ ماجد صاحب بولے۔ ہم نے انہیں ڈریکولا بنشے سے بُردقت روک لیا، ورنہ وہ میری بیوی کو چیرنے چھاڑنے کے لئے اسی نیت سے جھپٹے تھے۔ یہ سب دست موجود تھے۔ ان سے پوچھ لجھئے؟“

سیٹھ صاحب نے سب پر ایک نظر دوڑا تی۔ پھر بولے ”کون سی بیوی تھیں آپ کی ہی پہلی یا دوسری ہی ہوں گی۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے امتیاز یورپ اور امریکیہ کے قیام میں بھول گیا ہے کہ وہ کس ملک کا رہنے والا ہے اور کس معاشرے سے تعلق رکھتا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ کلب جائے ہی نہیں۔ مگر میں ہر قسم کی وہ سکی موجود ہے۔ یہیں پی پلا لے؟“

پکھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک مجرم بولا۔ ”یہ کلب آپ ہی کی سخاوت سے چل رہا ہے۔ آپ نے یہاں مجرموں کے لئے اتنی سہولتیں جمع کر دی ہیں کہ سارا شہر اس کا مجرم بنا چاہتا ہے مگر وہ جو آپ نے کم میں ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی کی شرط لگادی تھی، تو اس کی وجہ سے کوڑا کرٹ باہر رہ گیا ہے اور شہر کی کریم اس کلب میں جمع ہو گئی ہے۔ جس طرح غالب اپنے دیوان غالب کی وجہ سے کبھی نہیں مر سکتا، اسی طرح یہ کلب آپ

کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھنے گا۔ امتیاز صاحب پر زیادہ پابندیاں نہ لگائیے۔ ہماری رخوت یہ ہے کہ چند روز تک آپ بھی ان کے ساتھ آ جایا کیجئے۔ آپ کی وجہ سے وہ حد سے نہیں بڑھیں گے اور پھر ہمیں ان کی عادت ہو جائے گی۔“

”بات معمول معلوم ہوتی ہے“ سیٹھ صاحب کے خدوخال نارمل ہونے لگے۔ ”آ جاؤں گا“ پھر وہ ماجد صاحب سے مناسب ہوتے ہیں اگر امتیاز میاں سے کوئی زیادتی ہو گئی ہے تو انسان اللہ وہ آپ سے معافی مانگے گا۔ دراصل وہاں دلیست میں تمدیب اور شرافت کا معیار —“

ماجد صاحب ابھی تک تنے بیٹھے تھے۔ سیٹھ صاحب کو ٹوک دیا اور بولے: ”دلیست کے معیار ہم سے مختلف ہی، مگر بھی انہوں نے بھی اپنی بیویوں بیٹیوں کو نیلام کا مال نہیں بنایا۔“

سیٹھ صاحب نے چونکر ماجد صاحب کی طرف دیکھا۔ ایک لموج مسل دیکھتے رہے، پھر بولے: ”اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امتیاز کو کلب جانا ہے تو مجھے بھی جانا چاہئے اس کے ساتھ۔ آؤں گا ماجد صاحب۔ اگرچہ اس طرح میری نماز عشا بہت بیٹ ہو جائے کی مگر آؤں گا۔ کلب کو بد نام نہیں ہونا چاہیے۔“

سب لوگ مطمئن ہو کر چلے گئے تو سیٹھ صاحب نے فون کر کے امتیاز کو اپنے مرکزی کار و باری دفتر سے بلا یا اور اسے کلب کے یونیورسٹیوں کے ساتھ گلگتو کا حال بتایا۔ پھر بولے: ”اس کلب سے ہم نے بڑے بڑے فائدے اٹھائے ہیں بیٹا، اگر اس وقت ہم ارب پی ہیں تو یوں سمجھو کو اس ارب میں آدھا کنٹری ہو شن اس کلب کا ہے جس کے ماحول میں پختہ موسم ہو جاتے ہیں اور لوہا اتنا گرم ہو جاتا ہے کہ جدھر چاہو مودلو۔ میں اسے اپنی ملزا اور اپنے امپورٹ ایکسپورٹ کمپنیز سے بھی زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ اس کی گذوں اتنی زبردست ہے کہ اچھے اچھے اس کی رکنیت کے نئے ترستے ہیں۔ اسے

بِنَامِ نَمِيْسِ هُونَا چاہِیْتے۔ کل تم نے اچھا نمیں کیا؟“

وَکِیَا اچھا نمیں کیا وِیڈ؟“ امتیاز حیرت سے بولا۔ دیکھا ہوا تھا کل؟ کچھ بھی تو نمیں ہوا
تھا۔ بس ذرا سی زیادہ پی لی تھی۔“

وَتِمْ نے ایک سینٹر میرہ ماجد کی بیوی سے زیادتی کرنا چاہی۔“ سیٹھ صاحب نے

اسے اطلاع دی۔

امتیاز کو کچھ یاد آیا۔ اچھا تو وہ ہے ویڈ۔ آپ نے کبھی اسے دیکھا ہے؟ آپ نے کبھی
صلد میں گونڈھا ہتوں جسم دیکھا ہے؟“

سیٹھ صاحب بڑے مختلط ہوتے۔“ یہ ماجد کی دوسری بیوی ہے، بلکہ تمیری سمجھو۔
ایک مربھی حکی ہے، خوبصورت تو وہ سہالنے کی حد تک ہے مگر وہ ماجد کی بیوی ہے۔ تم کیا
کرنے پڑے تھے اس کے ساتھ؟“

وَاس کے حسن پر مبارکباد دینے ویڈ،“ امتیاز بولا۔“ اسے بتانے کے قدرت سے
بھی ایسے ایسے شاہنکار کبھی سمجھا رہا ہی تخلیق ہوتے ہیں۔“

ہباد تو تم نے ذہانت کی کی ہے،“ سیٹھ صاحب مختلط ہوتے جا رہے تھے۔“ مگر
یہ مشرق ہے امتیاز اور نیٹ، ایشیا اور بھر ایشیا جہاں اسلامی معاشرت پڑتی ہے۔ تم
ایکی سن میں اور بھر آسکفروں میں پڑھے اور کاروباری تجربے کے لئے یورپ اور امریکیہ کا
شہر شہر گھوے اور بھول گئے کہ تمہارا نام امتیاز الحمد ہے تو کیوں ہے؟ اور میں سب سے پھپ کر
پتیا ہوں تو کیوں پتیا ہوں۔ تمہیں آئندہ زندگی بیاں بس کرنی ہے اور ہمارے کلب کو بِنَامِ نَمِيْسِ
ہونا چاہیئے۔ پیو مگر تین چار پیگ سے زیادہ نہیں۔ میرا تو اتنے ہی میں کام ہو جاتا ہے۔
اگر محسوس کرو کہ تو اذن بگزرا رہا ہے، تو اٹھ کر چپے آیا کرو۔ کل سے میں تمہارے ساتھ چلوں
گا۔ تم پہلا کام یکر دے گے کہ ماجد سے معافی مانگو گے۔“

امتیاز نے پوچھا۔“ مگر ویڈ میں یہ معافی منز سے مانگ دوں تو کیسا رہے؟“

اس بات پر باب پیٹا ویڑک ہفتے رہے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے رہے۔

دوسرے روز سیٹھ صاحب بھی اتیاز کے ساتھ کلب پہنچے تو سب کے چہرے کھل اٹھے۔ سیٹھ صاحب میٹے کوئے کر ماجد صاحب کی میز پر گئے اور اتیاز کو اشارہ کیا، تو اس نے بڑی تیرے معافی مانگ لی مگر ساتھ ہی کہا: «مسنر ماجد کماں ہیں۔ میں ان سے بھی معافی مانگ لوں؟»
ماجد صاحب بولے: «کل کے واقعے سے ان کے اعصاب شیر ہو گئے ہیں۔
ٹھیک ہوں گی تو آ جائیں گی؟»

«ہاں، انہیں آنا چاہیئے! سیٹھ صاحب بولے: «اب کچھ نہیں ہو گا۔ کیوں اتیاز؟»
جی ہاں ڈیڈ۔» اتیاز نے تائید کی۔ «ہونا کیا ہے؟»
کلب کی زندگی معمول پڑا گئی۔ اتیاز پیتا تو سیٹھ صاحب موجود رہتے اور چوتھے پیگ کے بعد اس کا کلاس اٹھا کر میز کے نیچے رکھ دیتے۔ اتیاز جھومتا ہوا مسکراتا اور سیٹھ صاحب اسے بازو میں سمجھت کر لے جاتے۔ سب ممبر سیٹھ صاحب کی شرافت اور احساس ذمہ داری کی تعریفیں کرتے اور ایک روز تو ماجد صاحب نے بھی کہہ دیا کہ اگر سب کی پیٹیٹ سیٹھ صاحب کی طرح ہو جائیں تو سو شلزم اپنی ہوت آپ مر جاتے۔
پھر ایک روز ماجد صاحب اپنی بیکم کو بھی ساتھ لے آتے۔ ان کے گرد مزاج پُرسون کا ہجوم ہو گیا۔ سب جیان ہوتے رہے کہ زوس بریک ڈاؤن کے بعد مسنر ماجد کی جلد کیسی پہنچنے لگی ہے اور ان کی زمگت کے صندل میں کچھ ایسا اجالا ساکیا ہے جیسے ان کے اندر ٹیوب لائن ہو رہی ہے۔

سیٹھ صاحب موجود تھے۔ انہوں نے اتیاز کو چار پیگ کے بعد سینٹا اور لے گئے۔ اتیاز نے مسنر ماجد کو دیکھا ہی نہیں۔ ماجد صاحب نے بھی تواب ہال کمرے کے

آخری کونے کی ٹیبل سنبھال لی تھی۔

ایک رات سیٹھ صاحب نے ایک سینئر ممبر کے پاس جا کر اعلان کیا کہ اب امتیاز ایشیائی معاشرے میں شراب کے آداب سیکھ گیا ہے اور انہوں نے اسے فرست ڈویژن میں پاس کر دیا ہے۔ اس پر دیر تک قہقہے پڑتے رہے اور مسٹر ماجد اور ماجد صاحب یوں مسکراتے رہے جیسے یہ سارا کام زامنہ انہی کی تحریک سے ہوا ہے۔

اب سیٹھ صاحب نے کلب آنابند کر دیا۔ امتیاز اکیلا آتا، مگر چارپیگ کی حد بندیاں چلانگ کر کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ آٹھ ہوتے ہی وہ اٹھتا اور گرپٹا۔ دائرے بناتا، میزوں تپائیوں کو الٹا کر سیوں کو گھسیتا۔ یہاں سے دہان پکارتا پھرتا۔ — «عورت۔ اے عورت۔ اے عورت صاحبہ!»

عورتیں کلب میں موجود ہوتیں، مگر امتیاز کا عورت کو پکارنے کا انداز اتنا بے تحصیص اتنا ایسٹر کٹ ہوتا تھا کہ سب اپنے اندر احساس تفاخر بھی محسوس کرتیں اور اس کی حرکتوں پر ہفتی بھی چلی جاتیں۔

مگر چند دنوں کے بعد یوں ہوا کہ امتیاز آٹھ ہونے کے بعد اپنی نشت سے اٹھا تو گرتا پڑتا گھوتا، دائیے بناتا اور «عورت عورت» پکارتا ماجد صاحب کی ٹیبل کے پاس جا پہنچا۔ عورتوں نے امتیاز کی معنوں کی حرکات پر ابھی ہنسنا ہی شروع کیا تھا کہ امتیاز مسٹر ماجد کے سر پر جا کھڑا ہوا اور سارا کلب سانٹے میں آگیا۔

ماجد صاحب سرخ چہرہ لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمائیے۔
«عورت؟ امتیاز مسکرا یا۔ اس کی آنکھیں آدمی سے بھی کم کھل رہی تھیں۔

«عورت!» ماجد صاحب کرٹ کے ڈکون سی عورت؟

«کوئی بھی عورت؟ امتیاز بولا۔» بس ایک عورت۔ تمام پاس کرنے کے لئے، پھر اس نے جھک کر مسکراتے ہوئے مسٹر ماجد کو مخاطب کیا۔ «اے عورت صاحبہ!

میر جمع ہونے لگے، ماجد صاحب آگے بڑھے اور امتیاز کو دونوں گندھوں سے پکر کر بوسے۔ یہ عورت میری بیوی ہے مژا امتیاز۔ اگر آپ کو عورت کی ایسی ہی طلب ہے تو آئینے میں آپ کو عورت بلکہ عورتوں کے پاس لئے چلتا ہوں؟“
”وہ چلتے، امتیاز قدم اٹھانے کی کوشش میں رکھ رایا۔“ مگر ایک شرط
”وہ کیا شرط؟“ ماجد صاحب نے پوچھا۔

”شرط یہ کہ جو بھی عورت ہو، ایسی ہی فرست کلامس عورت ہو۔“ امتیاز نے سر ماجد کی طرف انگلی اٹھائی اور دینک اٹھاتے رکھی۔

”اس سے بھی بڑھیا۔“ ماجد صاحب بولے۔ ”آئیے“
اور ماجد صاحب کی گرفت میں آیا ہوا امتیاز دُور تک حیرت کا اظہار کرتا گیا۔ اس سے بھی بڑھیا ابکا اس سے بھی بڑھیا کوئی ہو سکتی ہے؟ نہیں ہو سکتی۔ نہیں ہو سکتی؟“
”ہو سکتی ہے۔ ہو سکتی ہے،“ ماجد صاحب اسے کھینچنے جا رہے تھے اور سارا لکب ہنکا بکا کھڑا دیکھ رہا تھا کہ ماجد صاحب یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہے جیسے اور کیا کرنے والے ہیں۔

ماجد صاحب نے امتیاز کو بڑی مشکل سے اپنی کار میں بٹھایا۔ امتیاز سارے راستے ماجد صاحب کو چوتارا اور ان کی گردن میں بازو ڈال کر ان سے اظہار محبت کرتا رہا۔
ماجد صاحب کی کار سیٹھ نواز احمد بھی کے محل میں داخل ہوتی اور پورچ میں رک گئی۔
پھر کار سے اترنے ہوئے ماجد صاحب نے امتیاز سے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں یا آپ کو ابھی بلتا ہوں؟“

”ویسی ہی ہو ماجد ذیر،“ امتیاز عجیب سرخوشی کے عالم میں تھا۔ ”آپ کی مسز کی سندل میں گندھی ہوتی؟“

”انشار اللہ،“ ماجد صاحب بولے۔ ”آپ جب تک ذرا سا سو بھجتے۔“

ماجد صاحب نے سیٹھ صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہیں ڈرائینگ روم میں بٹھایا گیا۔ سیٹھ صاحب اندر کسی کمرے میں شاید پی رہے تھے مگر سرپر یوں دو ماں باندھ رکھا تھا جیسے نماز پڑھ رہے تھے گھر تے ہوتے آتے یوں کیا تھے ماجد صاحب۔ رات کو، اس وقت ہے۔

”کوئی خاص بات نہیں سیٹھ صاحب“ ماجد صاحب اٹھ کھڑے ہوتے۔ ”ایک چھوٹی سی بات ہے۔ اگر آپ بیگم صاحبہ اور اپنی صاحبزادی کو بھی بالایں تو ظرا کرم ہو گا۔“ سیٹھ صاحب پلٹتے ہیں قیقناً یقیناً۔ ”مگر پھر رُک گئے۔ کوئی ناک بات معلوم ہوتی ہے؟“ ”بھی نہیں۔ اتنی ناک بھی نہیں۔“ ماجد صاحب بوے۔

سیٹھ صاحب سوچتے ہوئے چلے گئے۔ پھر انہی بیوی اور بیٹی کے ہمراہ واپس آتے۔ دونوں شب خوابی کے لباس میں تھیں مگر انہوں نے ٹری ٹری چادریں اور ڈھنڈی تھیں۔ ان کے چہروں پر تشویش تھی۔

”میں ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔“ ماجد صاحب باہر لپکے۔ پھر وہ امتیاز کو سہارا دیتے ہیں ڈرائینگ روم میں واپس آتے۔ اسے ایک صوف پر بٹھایا اور بولے: ”یہ لمحے سرٹا امتیاز۔ میں نے اپنا دعہ پوچھا کیا۔ یہ ہیں آپ کی بہن اور یہ ہیں آپ کی ماں۔ یہ دونوں بھی عورتیں ہیں۔ ملھیک ہے نا؟“

امتیاز دیوانوں کی طرح ماجد صاحب کو دیکھتا رہا۔ پھر دونوں بیٹھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر بیٹھوں کی طرح بک کر روتا ہوا صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی ماں، بہن اور آپ اس کی طرف ٹڑھے اور ماجد صاحب نے سینہ پھلا کر اپنے پھیپھڑے یوں بھرتے ہیں مدت سے ہوا کو ترس رہے تھے۔

جُوتا

کرمون ایک قوال پارٹی میں برسوں تک تالی بجا بجا کرتاں دیتا رہا۔ پھر آواز لگانا
بھی سیکھ گیا۔ چیچھے سے آگے آگیا اور بڑے قوال کے گھٹنے سے گھٹنا ملا کر بیٹھنے لگا۔ تب
بڑے قوال کو تشویش لاحق ہو گئی کہ کہیں وہ اس سے بھی آگے نہ لکل جاتے چنانچہ اس
نے کرمون کو چلنا کر دیا۔ کرمون کی آواز تو داجبی سی تھی مگر اس نے قوالی کے گُرسکیہ اتے
تھے اور ہمارے نیم کی آواز میں اپنی آواز چھپائیں کی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ اس نے اپنی
قالی پارٹی بنالی اور عرسوں، میلدوں اور شادی بیاہ کے جگھٹوں میں گاتارہا اور اپنے
تینوں بچوں کو پڑھا تارہا۔ دراصل بڑے قوال کے ساتھ اسے مک کے بڑے بڑے
شہروں میں جانے کا موقع ملا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے بچوں
کو تعلیم نہ دی تو وہ اس کی طرح اور اس کے باپ دادا کی طرح ڈھول شہنائی بھلاتے یا
قالوں کے چیچھے بیٹھتے تایاں پیٹھتے پھریں گے اور اس کی طرح اور اس کے باپ دادا
کی طرح ان کی باچپیں بھی ہمیشہ ڈھیلی رہیں گی۔

جب اس نے تینوں بچوں کو گاؤں کے مکوں میں داخل کرایا تھا تو سارا گاؤں
جیسے سنا ٹے میں آگیا تھا۔ لوگ کہتے تھے، حضرت آدم کے آسمان سے زمین پر
اٹرنے سے لے کر اب تک کے زمانے کا یہ پلامیراثی ہے جسے اپنے بچوں کو تعلیم

دینے کی سوچی ہے۔ چودھری نے اُسے دارے پر بُلایا اور ڈانٹا۔ ”شرم کر دکر موس
میراثی ہو کر اپنے بچوں کو پڑھاتے ہوئے کیا شادیوں میں اُن سے لوگ ڈھول شناختی
کی بجائے کتنا ہیں سنیں گے؟ کیوں بچاڑتے ہو انہیں؟ کیوں ناس مارتے ہو اپنے
نسی پیشے کا؟“

کرمون یہ سب سُنتا رہا اور جب کارہا۔ الجہنم سکرا تارہا۔ چودھری کی اس ڈانٹ پر
کاب کچھ بکوچی، اس نے کچھ کہا تو بس اتنا کم۔ ”اقبال قائم۔ عمر بھروال، ساگ
کھانے والے کا بھی ایک آدھ بار مرغ، بیٹھ کا سالم حکھنے کو جی چاہتا ہی ہے۔“
کرمون نے قولی کے نام پر جھیں اور ٹرھکیں مار مار کر پیسہ جمع کیا اور بچوں کو یوں
پڑھایا کہ وہ گرسیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آتے تھے تو میراثی کی اولاد لگتے ہی نہیں تھے
پھر وہ نہ جانے کیا پڑی پڑھ کر آتے تھے کہ میراثی کے بیٹے ہونے سے ثراستے بھی
نہیں تھے۔ ”ٹھیک ہے۔ تم کرمون میراثی کے بیٹے ہیں مگر چودھری کی طرح ہماری پیری ہی
بھی تو حضرت آدم ہی سے ملتی ہے۔“

پھر یہ لڑکے ادھر لا ہو رہا شاہ کا کو اور فیصل آباد کی طرف ملوں میں ملازم ہو گئے
اور باپ کو ہر میں اتنا بہت سارو پیری بخشی نہیں کر کرمون اپنی قول پائی۔ تو ڈکر اپنے گھر
میں رہنے لگا اور صاف سخترے کپڑے پہننے لگا اور خیرات دینے لگا اور پھر ایک سال
اس نے زکوٰۃ تک نکالی۔ چودھری نے یہ سنا تو اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے
لگا۔ ”حرام کی اولاد؟ اس نے کہا۔“ اتحلاک میں کہیں کا۔ دیکھ دینا لوگو، سال دو سال میں
خود زکوٰۃ مانگنے نکل کھڑا ہو گا۔ اگر اس وقت تک قیامت نہ آگئی تو۔ ایک میراثی جب
زکوٰۃ دینے لگے تو سمجھو سورج سوانیزے پر اترنے کو ہے۔“ اور چودھری پھر یوں
ہسنے لگا جیسے رد نے لگا ہے۔

کسی نے کرمون کو چودھری کی یہ بات بتائی تو وہ بولا۔ ”چودھری کیوں خفا ہو رہا ہے۔“

میں نے اسے تو زکوٰۃ نہیں بھجوائی۔ اسے بھی دیتا مگر بھی زکوٰۃ لینے کا حق نہیں بنتا اس کا
آہستہ آہستہ حقدار ہو جائے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے۔“
جن لوگوں نے کرمون کو چودھری کی بات بتائی تھی انہوں نے چودھری کو کرمون کی
بات بتانا بھی ضروری سمجھا۔ اس وقت چودھری شریعت پر رہا تھا۔ یہ بات سنی تو اسے
اچھو ہو گیا اور شریعت اس کی ناک سے بہنے لگا۔

پھر ایک روز کرمون گلی میں بیٹھا لوگوں سے گپ لاہک رہا تھا۔ بالوں باتوں میں
سکنے لگا۔“میں میراثی ہوں پر تین بالوں لوگوں کا باپ بھی ہوں اس لئے جی چاہتا ہے یہاں
گلی میں بیٹھنے کی بجائے ایک پتی بیٹھک بناؤں۔ اس میں پنگ اور مونڈھے بچھادوں اور
تم سب کے ساتھ بیٹھ کر دنیا جہان کی اچھی اچھی، پیاری پیاری میٹھی میٹھی باتیں کروں۔ بیٹھنے
کے لئے چودھری کا دارالوفہ ہے مگر میں وہاں بیٹھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے سر کے بل کھڑا ہوں
یہ بات کر کے وہ اپنے کھر گیا۔ حقہ تازہ کیا۔ چلم پڑاگ سجائی اور کش لگانے کے لئے
چار پانی پر اچھی بیٹھا ہی تھا کہ چودھری کی طرف سے اسے بلدا آگیا۔ اس نے دارے پر
قدم رکھا ہی تھا کہ میں چار مسٹنڈوں نے اسے دبوچ کر گرا دیا اور چودھری کا پلا ہوا ملشی اس
کی پیٹھ پر جوتے بر سانے لگا۔ ساتھ ساتھ چودھری اسے گما بیان دیتا رہا اور کہتا رہا۔“بیٹھک
بناتے کامیکینہ، داراللگائے کامیری طرح ہے چار پیسے کیا آگئے کہ اپنی اوقات ہی بھول گیا
رذیل۔ لگاؤ۔ اور لگاؤ۔“

کرمون کو اتنے جوتے لگے کہ اگر کسی اور کو لگتے تو وہ لگتی بھوول جاتا، مگر کرمون گناہ
رہا۔“میں تو گناہ رہا۔“ اس نے اپنے ملنے والوں کو تباہیا۔ میں تو گناہ رہا تاکہ قیامت
کے دن خدا کے سامنے جو توں کا حساب چکانے میں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جاتے۔ باسٹھ
لگے تھے۔ باسٹھ پورنے کر دیا گا خدا کے حضور انشاء اللہ۔ ایک کے ستر نہ سہی۔ چودھری
کے لئے تو میرا ایک ہی جو تباہت ہے سارے جہان کی مخلوق کے سامنے۔“

انہی دنوں دوٹ درج ہو رہے تھے۔ دوٹ درج کرنے والے اس گاؤں میں بھی آتے اور کرموں کا دوٹ بھی درج کرنے لگے۔ تب ان میں سے ایک بولا۔ ”بھتی تم اپنا نام کرما بتاتے ہو مگر کرما کیا نام ہوا اکرم الہی ہو گا، یا حرم علی یا کرم دین۔ کرما کوئی نام نہیں ہوتا۔ یہ تمہارے اصلی نام کا بلکہ اڑ معلوم ہوتا ہے۔“

کرموں بولا۔ ”میں میراثی ہوں جی، اور میراثیوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میرے نام کا بلکہ اڑ تو کرموں ہے جیسے میرے باپ کو لوگ کاموں کرتے تھے پر اس کا اصلی نام گاما تھا۔“ زوج ہو کر انہوں نے فہرست میں ”کرما ولد گاما ذات میراثی پیشہ گداگری“ کے الفاظ لکھنے تو کرموں بچڑا گیا۔ ”نہیں صاحب جی۔ میں گداگر نہیں ہوں۔ گدا کا ایک پیسے بھی مجھ پر حرام ہے۔ میں تو عمر پھر اپنی محنت کی کمائی کھاتا رہا۔ میرے نجھے پڑھ لکھ گئے تو یہ بھی میری محنت کی کمائی ہے۔ اب وہ محنت کرتے ہیں اور میری محنت کا بدلا چکاتے ہیں۔ میں تو اب زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں۔ پھر میں گداگر کیسے ہو گیا۔ گداگری اتنی سستی ہے تو چودھری کو گداگر لکھوکہ کسان محنت کرتا ہے اور چودھری کھاتا ہے۔“

چودھری کو خبر میں کہ کرموں نے دوٹ درج کرنے والوں کے سامنے اسے گداگر کہا ہے۔ اسے فوراً دارے پر بُلایا گیا اور سب گاؤں والوں کے سامنے چودھری نے اپنے منشی سے اسے جو ٹتے لگواتے ہوئے لگ رہے تھے جب کرموں اچانک اٹھ بیٹھا اور منشی کی کھائی جکڑا کر بولا۔ ”بس باسٹھ پُردے ہو گئے۔ میرا کوڑہ مجھے مل گیا۔ زیادہ لگاؤ گے تو قیامت کے دن چودھری جی کو زیادہ تکلیف ہو گی۔“

”مجھے تکلیف ہو گی؟“ چودھری یوں حیران رہ گیا جیسے اس کے سر پر سورج گر پڑا ہے۔ ”مجھے کیسے تکلیف ہو گی کیمینے؟“

کرموں کے تیور بدلتے ہوئے تھے۔ بولا۔ ”چلتے آپ کو تکلیف نہیں ہو گی تو آپ کا حساب پُر اکرنے والے فرشتے کو تکلیف ہو گی۔“

”میرا حساب ہے“ چودھری نے اس طرح پلو بدلا جیسے پنگ ہی پر کھڑا ہو جاتے
گا۔ ”کیا بخت ہو، میرا حساب کیسا ہے؟“

”بھی یہی، غربیوں کو جو تے لگانے کا حساب۔ ایک کے ستر یا کرموں مزید
جو توں کا انتظار کئے بغیر انہ کھڑا ہوا تھا اور زمین پر سے اپنی پچھلی اٹھا کر اسے جھاڑ
رہا تھا۔“ اب آپ خود حساب لگایجئے اقبال قائم، کہ باسٹھ یہ جوتے اور باسٹھ دہ پچھلے
کھل ہوتے، خدا آپ کا بھلا کرے، ایک سوچ بیس۔ قیامت کے دن اگر ایک کے
ستر لگیں گے تو ایک سوچ بیس کے سنتے لگیں گے۔ منشی جی، حساب لگا کر بتا دو
چودھری بھی کو۔“

چودھری نے غصے میں اپنے جو تے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر جب دیکھا کہ
دارے پر موجود بیشنز لوگ کرمون کی باتوں پر دانت نکالے کھڑے ہیں تو ہاتھ دا اس
لانے کی بجائے اس نے زمین پر سے ایک نکا اٹھایا اور اسے اپنی پوروں ہیں یوں
مسلسلہ وہ سفوف سابن کر رہ گیا۔ گالیاں اس کے ہنڑوں پر کیکپاٹی رہ گئیں۔
اس وقت پرندے والیں آشیانوں کو جا رہے تھے۔ شام قریب تھی۔
چودھری اس واقعے کے بعد کرمون سے بہت سنبل کر بات کرنے لگا۔ کرمون
میراثی تو تھا مگر کھاتا پیتا میراثی تھا اور کھاتے پیتے لوگ کھاتے پیتے لوگوں سے بات ہمیشہ
سوچ سمجھ کرتے ہیں، جیسے امریکہ روس سے اور روس امریکہ سے بات کرتا ہے۔ تاہم
جب چودھری کے دارے پر سے فالتو لوگ اٹھ جاتے اور صرف اس کے قریبی لوگ باقی
رہ جاتے تو وہ جلے دل کے پھچپوے چھوڑتا۔ ”اب یہ کمیشہ کڑوی گولی کو تھوک دیتا ہے۔
اب میں اسے شکر چڑھی گولیاں کھلاؤں گا۔“ پھر وہ حالات کے طویل تجزیے میں ہڑو
ہو جاتا۔ ”لوگ کہتے ہیں شراب کا نشہ بڑا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں نو دلیتوں کے لئے
روپے کا نشہ اس سے بھی بڑا ہے۔ کرمون کو دیکھو۔ کہاں تو جب بھی مجھے یہ میراثی زادہ

ہلتا تھا، اقبال قائم کی رٹ لگاتا ہوا رکوع میں چلا جاتا تھا، اور کہاں یہ دن
کہ کل کہنے لگا۔— میں ادھر لا ہو، فیصل آباد کی طرف جا رہا ہوں۔ کوئی چیز چاہئیے
تو لینا آؤں، کوئی چھڑی وڑی، کوئی جوتا ووتا! یہ سب روپے کافی ہے۔ پھر چودھری
نے گردن کو کھینچنے کی حد تک کھینچ کر ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔ ”کہیں وہ کسی کو نہ
کھدرے میں بیٹھا تو نہیں ہے حرام کی اولاد۔ یاد ہے ایک بار میں یہیں دارے پر
اسی کی باتیں کر رہا تھا اور انہیں میں مجھے پہنچا کر دہ کہیں بھی ایک طرف بیٹھا
ہے؟ میں نے اس نسلی کشگر کے نتے ٹھاٹھگی بات کرتے ہوئے کہہ دیا کہ کوئا اگر
مور کے پر سجائے تو بھی کوئا ہی رہتا ہے۔ اس پر وہ۔ میری چلپیں بھرنے والا۔
میرے اصلی صاف کرنے والا۔— بھرے دارے میں بولا۔ ”ویسے چودھری گی۔
سیانوں سے سنا ہے کہ مور بھی کوئے ہی کی نسل میں سے ہے۔ صرف زنگ دار پر نکال
لتے ہیں اور ناچنا سیکھ گیا ہے؟”— یاد ہے نا، روپے نے اتنے چھٹے ٹھاٹھیے
یہیں اس افلاظون کے پتھے کے، ورنہ یہاں میرے سامنے بلی کی طرح منتنا تا چھڑتا تھا۔
روپے نے اس کی زبان کھینچ کر میرے جو تے بھر کی کر دی ہے۔ مگر مجھے بھی ایسے
نہ دو لقیوں کو آپے میں رکھنے کے گزر معلوم ہیں۔ جو تے پر چاہے سنہرا کام ہندا ہو،
رہے گا تو وہ جوتا ہی۔ اور پاؤں ہی میں پہنچاتے گا۔ اس میراثی کے پچے کو میرے
ٹکاؤں میں رہنا ہے تو میراثی بن کر رہنا ہو گا۔ دیکھو لینا۔“

سردیوں کے دن تھے۔ کہ میوں چند روز اپنے بیٹوں کے ہاں گزار کر واپس
آیا تو اس نے سنترے زنگ کا کمل اور ڈھر کھا تھا۔ لوگ اس کمل کو چھوتے تو
حیران رہ جاتے کہ کیا کسی بھیر کی اون آتنی نرم بھی ہو سکتی ہے؟ اکروں کے ایک
رشته دار نے اس کمل کو چھو تو بسم اللہ پڑھ کر کمل کا کونا منہ میں ڈال لیا اور بولا۔ ”سوچی کا
حلوہ ہو تو ایسا ہو کہ جب جی چاہا اور ڈھلیا، جب جی چاہا کھالیا۔“

خود کرموں ملنے والوں کو بتا رہا کہ پورے ایک سو کا ہے۔ اور چھر صرف خوبصورت ہی نہیں ہے۔ اندر سے بھی بڑا گنی ہے۔ باہر رفت گرمی ہو تو کبل میں انگلیشی سی دکمی روتی ہے — پوہ کی ٹھنڈی میں بھی پسینہ آنے لگتا ہے پنجتھن پاک کی قسم!

پوری بستی میں اس کبل کے چرچے ہونے لگے۔ بات چودھری تک بھی پہنچی مگر یوں کہ کرموں کو کہا تھا — «ایسا کبل تو چودھری کو بھی نصیب نہیں ہوا ہو گا!» — اس پر چودھری یوں مُسکرا جائیے کسی نے خربوزے کا ایک سراچھری سے چیر دیا ہے۔ کرموں کے روپے نے چودھری کو سیاستدان بنادیا تھا۔

ایک دن کرموں یہ کبل اور ٹھنڈے چودھری کے دارے کی گلی میں سے گزار چودھری اپنے آدمیوں کے ساتھ باہر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ کرموں کو بُلا دیا اور اس کے کبل پر ہاتھ پھیر کر بولا ڈیکھاں سے مارا؟»

کرموں پاس ہی ایک سل پر بیٹھ گیا۔ میں نے تو — اقبال قائم — ساری عمر میں ایک پتا تک نہیں مارا، کبل کماں سے ماروں گا۔ اور چھر کبل بھی ایسا کہ آپ نے بھی چھوا تو میں نے آپ کے رو نگئے کھڑے ہوتے دیکھیے۔

چودھری کا چہرہ چھو یوں تن گیا جیسے اس کی چوری پھرٹی گئی ہے۔ خربوزے میں ایک اور چیر ٹپا اور چودھری بولا۔ «چلو مارا نہیں تو لیا کماں سے؟»

کرموں نے جواب میں لمجھ بھردیر کی۔ اس کی انگلیں چکیں۔ اپنے بیٹوں کے ذکر پر ہمیشہ یوں معذوم ہوتا تھا جیسے اس کی پتیوں میں رکھے ہوتے چرانخوں کی دوین جل اُٹھی میں? «کالاشاہ کا کوئی میرا بیٹا ہے نا سرفراز!»

«ہاں — وہ سرفراز!» چودھری نے کرموں کی تصحیح کی۔

«جی ہاں۔ وہی سرفراز! کرموں نے اپنی غلطی کی تصحیح کو کوئی اہمیت نہ دی!» وہ کہنے لگا کہ بابا۔ اب کے یہاں سے ایک اچھا ساجوتا لے جاؤ۔ میں نے کہا، بیٹے۔ جو تے

ادھر گاؤں میں بہت ہیں۔ کچھ اور لادو۔ کوئی تخفہ چیز۔ وہ یہ کمبل لے آیا۔ میشیا میں اس کے کسی دوست کا آباد ہتا ہے۔ وہ یہ کمبل اپنے بیٹے کے لئے لایا۔ سرفراز نے اس سے اپنے ابا کے لئے خرید لیا۔“

چودھری بولا۔“ دیکھو کر مون۔ اگر میں کہوں کہ مجھے یہ کمبل چاہیئے۔ تو۔؟“

”تو ے یعنی ناقبال قائم“ کر مون نے گرج کر جواب دیا۔“ سرفراز پوچھے گا تو کہہ دوں

گا کہ چور لے گئے،“

چودھری نے کر مون کی بات زور سے ایک قہقہے میں اڑانے کی کوشش کی مگر صفت معلوم ہوتا تھا کہ اس قہقہے کا پھیپھڑوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر وہ ایک دم سنجدہ ہو کر بولا۔“ اس کا کیا لوگے ہے؟“

”کچھ بھی نہیں اقبال دام“ کر مون کی آواز میں بڑی آسودگی اور بے نیازی تھی۔

”مگر میں مُفت نہیں لوں گا“ چودھری بولا۔“ یہ ہماری خاندانی عادت ہے کہ مُفت چیزیں دیتے ہیں یعنی نہیں ہیں۔ تم تو جانتے ہو۔ تمیں تو عمر بھر کا تحریر ہے۔“

”جی ہاں“ کر مون نے کہا۔“ پر کبھی کبھی یعنی والوں پر دینے کا وقت بھی آجائی ہے۔

اقبال قائم۔ لے یعنی نا۔ سرفراز مجھے اور بیخج دے گا۔“

”نہیں کر مون“ چودھری بولا۔“ تم ہمارے میراثی ہو۔ تمہارے باپ دادا نے ہمارے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ مانگو کیا مانگتے ہو اس کمبل کا۔ سرفراز نے تمیں بتایا تو ہو گا کہ اس نے کمبل کے کتنے روپے دیتے تھے۔“

”جی ہاں سرفراز نے بتایا تو تھا۔“ کر مون کی آواز میں منصوبہ سازی کی گمراہی تھی۔ پھر وہ جیسے ایک نیچے پر پیچ کر سکلنے لگا اور بولا۔“ کمبل دوسرے ملک کا ہے ناجی۔ میں نے کہا بھی سرفراز سے کہ اتنی فضول خرچیاں مت کیا کرو۔ بولا۔ کوئی بھی چیز ہمارے ابکے آرام سے منگی نہیں ہے۔ آپ ٹھیک کہتے تھے۔ تعلیم نے رکوں کے دماغ بگاڑ دیتے

ہیں اقبال قائم — قیمت کچھ زیادہ ہی ہے؟

”یعنی اتنی زیادہ ہے کہ سرفما میراثی ری قیمت ادا کر سکتا ہے اور میں نہیں کر سکتا؟“

— چودھری اپنے غصے کو چھپانے کی کوشش کے باوجود پُردی طرح نہ چھپا سکا۔

” بتاؤ کتنے میں آیا ہے۔ پچاس سو، دو سو، تین سو — کتنے ہیں؟“

”تین سو تو خیر نہیں جی۔“ کرمون نے چودھری کے منشی کی طرف یوں دیکھا جیسے

جو تے لگانے سے پہلے فرشی نے کرمون کو دیکھا تھا۔“ مکن دوسو باسٹھ میں آیا ہے۔“

اس نے حاضرین پر داد طلب نظری ڈالیں۔

” اور اتنی رقم تمہارے نیٹے نے ادا کر دی؟“

”وکمَا تَكْجِيَاتٍ هُوَ نَا إِقْبَالٌ قَائِمٌ“

” تو تم مجھ سے دوسو باسٹھ روپے لو گے؟“

” آپ باسٹھ رہنے دیجئے۔ ان کا حساب پھر ہوتا رہے گا۔ دوسرے دے دیجئے“

” دوسو باسٹھ میں باسٹھ اور ملا کر کیوں نہ دوں؟“ چودھری نے فاتحانہ انداز سے

کہا۔ ”آخر قسم ہمارے میراثی ہو۔“

” چلنے زیادہ دے دیجئے اقبال قائم — تین سو بیس دے دیجئے۔“

” تمہیں تو دو کامداروں کی طرح ٹھیک ٹھیک حساب کرنا بھی آگیا!“ چودھری نے

نے دل گلی کرنے کی کوشش کی۔

اور کرمون کبل اتارتے ہوئے بولا۔ ”میں تواب بے حساب اخراج کرتا ہوں اقبال قائم۔“

بس کچھ آتا ہے تو یہ باسٹھ کا حساب آتا ہے۔“

چودھری نے کرمون کے چلاتے ہوئے چاپک سے بے نیاز ہو کر اپنے منشی

سے کہا۔ ” وجہی دے دو اسے تین سو چوبیس۔“

” روپے منشی جی۔ تین سو چوبیس روپے!“ روپے کے لفظ پر زور دیتے ہوئے

کرمون نے منشی کو تاکید کی۔

”رودپے نہیں تو پیسے ہے؟“ منشی نے تمیض کے نیچے پہنچی ہوتی داسکٹ کی اندر ویں جیب میں سے نوٹوں کا ایک گھٹانہ نکالتے ہوئے پوچھا۔

”میرا مطلب تھا کہیں آپ تین سو چوبیس روپے دینے کی بجائے تین سو چوبیس بجوتے لگانے نہ بیٹھ جائیں۔“

چودھری بیمیت سب لوگ زور سے ہنسنے مگر سب کی ہنسنی کا مفہوم الگ الگ پہچانا جا سکتا تھا۔ چودھری تو یوں ہنسا جیسے اس کا سینہ نہیں کی ایک چادر ہے جس پر کنکروں سے چاند ماری ہو رہی ہے۔

کرمون نے روپے لئے اور مسکرا آتا ہوا چلا گیا۔

تب چودھری اپنے سامنے کبل پھیلوا کر مسکرا یا۔ اسے خوب اچھی طرح جھڑوایا جیسے کبل کا میراثی پنا انکال رہا ہے۔ اسے نہ کرا کے منشی کے حوالے کیا کہ گھر پہنچا دو۔ ”کہنا اے دن بھر دھوپ دکھائیں اور بھر کسی پیٹی میں بچینیک دیں؛“ بھروسہ حاضرین سے مخاطب ہوا۔ ”درجنوں پڑے ہیں اس طرح کے کبل۔ مگر میں دو پیسے کے میراثی کو ڈھانی تین سور روپے کا کبل اور ڈھنے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جوتے کو پاؤں ہی میں رہنا چاہیئے۔“

اندماں

پاکستان کے اس ہوائی اڈے پر اترنے کا احساس بالکل اس احساس کے مشابہ تھا جو آج سے چوبیس سال قبل، پہلی بار ڈھاکے کے ریلوے کے ٹیشن پر اترنے ہوتے اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ پھر اس دو ران میں جلال الدین نے ڈھاکے سے بیان تک اور بیان سے ڈھاکے تک کتنی بہت سی پروازیں کی تھیں پہلے چار گھنٹے کا سفر تھا۔ پھر تیر قار طیارے آئے تو وہ ڈھاکی گھنٹے میں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان پنج باتا تھا، مگر آج وہ ڈھاکے سے چل کر ڈھاکی میں نے بعد مغربی پاکستان کے اس ہوائی اڈے پر اترنا تھا۔ اب کے دن کے ایک حصے سے دن کے دوسرے حصے تک پہنچنے کے لئے اسے پورا جنوبی ایشیا طے کرنا پڑا تھا۔ ڈھاکے سے کلکتہ، دہلی سے ٹینے، پھر کھٹندو، کھٹندو سے بنکاک اور بنکاک سے بیان! اس نے سوچا بعض آزادیاں بظاہر یکے ناقابل فہم شادٹ کٹ سے ایک دم آدمکنی ہیں مگر اس سے تک کے ایک قریبے سے دوسرے قریبے تک کے فاصلے کتنے بڑھ جاتے ہیں۔

طیارے کی کھڑکی میں سے جلال الدین نے دیکھا کہ سیر ہی طیارے کی طرف لاٹی جا رہی ہے اور ہوائی اڈے کی دوسری منزل پر، جنگل کے ساتھ ساتھ، لوگوں کی قطاریں کی آنکھیں طیارے کے دروازے پر گڑای ہوتی ہیں کہ کب سیر ہی لگے، دروازہ کھلے

اور اس میں سے ان کے پیاروں کے انوس چہرے نو دار ہوں۔
 مسافر اپنے اپنے بیگ اور بریف کیس سنجال کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے مگر
 جلال الدین دور جنگلے کے ساتھ لگے ہوتے مردوں اور عورتوں کے چہروں کو بغور دیکھ
 رہا تھا کہ شاید طاہر کو کسی طرح اس کی آمد کا علم ہو گیا ہو۔ دور سے ان چہروں کے خطوط
 واضح نہیں تھے۔ سب ایک جیسے لگتے تھے۔ اور پھر اچانک اس کے اندر جیسے
 ایک انار سا چھوٹا اور سارے چہرے روشن ہو گئے۔ وہ مسکرانے لگا۔ وہ ان سب کو
 جانا تھا۔ وہ سب طاہر تھے۔ وہ سب پاکستانی تھے۔ اس کے جی میں یہ تھا امداد پری
 کہ وہ در دا زہ کھلتے کا انتظار کرتے بغیر کھڑکی میں سے کسی طرح باہر نکل جاتے اور ہر
 کی طرح قلا پنیں بھرتا ہتوا، ہوانی اڈے کی دوسری منزل پر پہنچے اور سب سے ایک
 ایک کر کے لپٹا چلا جاتے۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ «چلو اٹھو عابدہ! پھر وہ چونک پڑا اور جھک
 کر آہستہ سے کہا۔ "سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ آخر یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟"
 "تماشا؟" عابدہ بیگم نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے گھورا۔
 "ارے!" وہ سیست پر بیٹھ گیا۔ "زہست بیٹی قم بھی رو رہی ہو؟"
 ایک لائن کی ایک ہوش نے قریب آ کر بہت میٹھی اور ملائم انگریزی میں اُن سے
 پوچھا۔ "میں کوئی خدمت کر سکتی ہوں؟"

"شکریہ" جلال الدین گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جیسے اس نے طیارے میں اعلان
 کر دیا۔ "ہم مشرقی پاکستان سے آ رہے ہیں۔ ہمارا نوجوان داما دیہیں کہیں چھاگا ہنگ میں
 رہ گیا ہے۔ وہ رشتے میں میری بیوی کا بھانجا بھی تھا، ہم پاکستان سے پل کر پاکستان
 آ کے ہیں تو اب میری بیوی کو اپنا بھانجا یاد آ رہا ہے؟"

"اوہ!" ایک ہوش نے اس ایک لفظ میں نہ جانے افسوس کا انخلاء کیا تعجب کا۔

پھر وہ نزہت پر جھکی اور آنسو پوچھنے کے لئے اسے اپنارو مال پیش کرتے ہوتے بولی۔ ”مت رو پیاری لڑکی خدا کرے گا تمیں تمہارا میاں مل جائے گا۔“ پھر وہ چونک کر سید حمی کھڑی ہو گئی اور جلال الدین سے پوچھا۔ ”یہ آپ کی بیٹی ہے نا؟“

”جی۔“ جلال الدین بولا۔ ”اس کی شادی چھ سات ماہ پلے ہوئی تھی۔“

”اوہ!“ اب کے ہوش کے اس لفظ میں واضح طور پر دکھ تھا۔ پھر وہ نزہت کے سامنے جھکی اور بولی۔ ”میں وعدہ کرتی ہوں پیاری لڑکی کہ اگر ہماری ایک لائیں نے ڈھل کے کی مردی شروع کی تو میں وہاں جب بھی جاؤں گی، تمہارے میاں کو تلاش کروں گی اور اسے تمہارے پاس کر اچی پہنچا کر دوں گی۔ وعدہ رہا۔ ہاتھ ملا دی۔“

نزہت آنسوؤں میں مسکرنے لگی۔ اس نے بڑے پیار سے ہوش کو دیکھا، اس سے ہاتھ ملا�ا، پھر مشین کی سی تیزی سے پرس کھولا اور ایک کتاب میں سے ایک تصویر نکال کر ہوش کو تھادی۔

”اوہ، سویٹ!“ ہوش بولی۔

”اس کا نام اشرف ہے۔“ جلال الدین بولا۔ ”اشرف رضا۔ جنگ کا بھی کچھ ایسا زور نہیں تھا جب وہ ادھر چلا گا انگ کی طرف دو تین دن کے لئے گیا تھا پر دو تین ماہ تک واپس نہ آیا۔ ادھر ہمیں اپنی جان کی پڑی تھی۔ ہم ڈھاکے سے بھاگے اور یہاں پہنچنے میں ڈھائی میتھے اور لگ گئے۔ یوں سمجھئے کہ اشرف چھ ماہ سے لاپتہ ہے۔ لاپتہ میں اس تصویر کے پیچھے اس کا نام اور رہائش اور محلے کا پتہ وغیرہ لکھ دوں۔“

”کیوں؟“ نزہت نے اشرف کی تصویر ہوش کے ہاتھ سے اپک لی۔ ”یہ تیری تصویر ہے۔ میں کیوں دوں کسی کو۔“ پھر پرس کھول کر تصویر اُس میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”ایک تصویر اُمی کے پاس بھی تو ہے۔ وہ وے دستجھے نا۔“

تمینوں مسکراتے۔ عابدہ بیگم نے اپنا پرس کھول کر اشرف کی تصویر نکال دی۔

جلال الدین نے اس کی پشت پر ساری تفصیل اور پھر پاکستان میں طاہر کا پتہ بھی لکھ دیا۔ ہوش نے تصویر لیتے ہوئے اپنا وعدہ دہرا�ا کہ وہ امتحان کو تلاش کر کے دم لے گی۔

یکاکی جلال الدین نے دیکھا کہ طیارہ بالکل خالی ہو چکا ہے اور ائیر لائن کی ایک اور ہوش جو دروازے پر مسافروں کو خدا حافظ کہہ رہی تھی اور ان سے فارغ ہو کر ان کی طرف آ رہی ہے آتے ہی وہ بولی۔ "معاف کیجئے گا۔ —

مگر جلال الدین نے اسے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔ "ہم معافی چاہتے ہیں۔ درصل —" مگر اب کے پہلی ہوش نے جلال الدین کی بات کاٹ دی اور کسی پورپی زبان میں ہوش سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے امتحان کی تصویر بھی دکھانی۔ اس دوران میں جلال الدین، عابدہ بیگم اور نزہت سیڑھی کا آدھا حصہ کر چکے تھے۔ دونوں ہوشیں پاک کر آئیں اور آخری زینے پر نہایت پیارستے انہیں خدا حافظ کہا۔

مگر جلال الدین اس آخری زینے پر رُک گیا۔ ذرا سے انتظار کے بعد عابدہ بیگم بولی۔

"چلتے نا۔ کیا سوچ رہے ہیں؟"

اور جلال الدین بولا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے پاکستان کی زمین پر قدم رکھا تو کیسی یہ بچھے کرنٹ نہ مار دے!" پھر وہ ہنسنے لگا۔ عابدہ بیگم اور نزہت کے باٹھ پکڑ کر بسم اللہ پر حمد اور زمین پر پاقوں رکھ دیا۔

سب کے جمیون میں ایک سنہی سی دوڑگی۔ خوف کی طرح کبھی کبھی مکمل تحفظ کا احساس بھی تو جنم میں گلکی پیدا کر دیا ہے۔

ایئر پورٹ کی بالائی منزل استقبال کرنے والوں سے قریب قریب خالی ہو چکی تھی۔

مگر ہوا اتنی تیز چل رہی تھی کہ ان کے باس پھر پھر اڑا رہے تھے اور جلال الدین کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سارا شہر ان سے پٹا پڑ رہا ہے۔ غیر ملکی ہوشیوں نے جس

ہمدردی اور انسانیت کا منہابہ کیا تھا، اس کے جواب میں جلال الدین کا وطن سے محبت کا جذبہ چاہتا تھا کہ کوئی پاکستانی اس کی طرف بھاگتا ہوا، اسے پکارتا ہوا بازو پھیلاتے ہوئے آئے اور کہ کہ اے میرے بھڑے بھائی اور صراس رستے سے آؤ جہاں میں نے تمہارے لئے اپنی آنکھیں بچھا رکھی ہیں۔ آؤ میں تمہیں اپنے سر پر بٹھا لوں، مگر — جلال الدین نے سوچا — یہ ہوائی اڈہ ہے جہاں سب لوگ بہت صرفت ہوتے ہیں۔ آخر کسی کو کیا پتہ کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آ رہا ہوں — چنانچہ اہل شہر کی بجائے اس نے شہر کی ہوا سے یہ تسلیم حاصل کر لی اور عابدہ بیگم اور نزہت سے کہنے لگا۔ دیکھا، پاکستانی ہوا کیسے ہمارے کپڑوں میں گھس کر ہمارے گدگدی کر رہی ہے!“ اس پر نزہت یوں گلٹکی جیسے کسی نے سچ مج اس کی تسلیم میں پانچ ڈال کر اس کی پسلیوں پر انگلیوں کی پوریں دوڑا دی ہیں۔

ہوائی اڈے پر قدم رکھنے سے لے کر ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر آنے تک جو شخص بھی سامنے آیا، وہ اسے اپنا شناسا لگا۔ وہ حیران تھا کہ یہ لوگ اسے دیکھ کر رُک کیوں نہیں جاتے، چونکہ کیوں نہیں پڑتے، ” ہیلو جلال الدین!“ کافروں کا نفر و لگا کر وہ اسے سینے سے بھیخ کیوں نہیں لیتے؟“ معاف کیجئے گا!“ اس نے مجسم مسکرا ہٹ بن کر لا دنچ میں ایک شخص کو روک لیا تھا۔ “ آپ کا چہرہ جانا پچانا سا لگتا ہے!“

” مگر —“ وہ شخص ہٹکانے لگا۔“ مگر معاف کیجئے گا، میں نے آپ کو نہیں پچانا!“

” میں —“ جلال الدین مسکرا تے جا رہا تھا۔“ میں جلال الدین ہوں۔ محمد جلال الدین۔

ڈھاکے سے آ رہا ہوں۔ میرے خیال میں وہیں ڈھاکے میں کہیں آپ سے مل چکا ہوں؛“

” مگر میں تو ڈھاکے کے کجھی گیا ہی نہیں ۔“ وہ شفہ بولا۔“ آپ کو دھوکا ہوا ہے،“ اور

اور وہ جلال الدین کو جیسے دیرانے میں چھوڑ کر آگے ٹرد گیا۔

” دیکھئے!“ عابدہ نے ہر کا بکا بھڑے جلال الدین کے پاس آ کر کہا۔“ لوگوں کو

پچاننا چھوڑیتے اور طاہر جاتی کے باں پہنچنے کا بندوبست کیجئے۔
اور جلال الدین ہوانی اڈے کی عمارت سے یون نکلا جیسے دوسری بار ڈھاکے
سے نکل رہا ہے۔

اس نے جس بھی میکی ڈرائیور کو چلنے کو کہا، جواب ملکہ میثیر خراب ہے۔ ایک بار
اس کا بھی چاہا وہ ان سے اپنے آپ کو متعارف کرادے۔ اسے قیمین تھا کہ اس کے
منہ سے ہم ڈھاکے سے آرہے ہیں۔ کے الفاظ مُسٹر میکی ڈرائیور اسے پشاں لیں گے۔
مگر اب اسے کچھ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے جب وہ اپنا تعارف کراہا ہو گا تو دراصل
بھیک مانگ رہا ہو گا۔

میثیر اس ڈرائیور کا بھی خراب ہی تھا جو چلنے پر رضا مند ہو گیا تھا مگر ساتھ ہی اس نے
پندرہ روپے طلب کرنے تھے۔

”پندرہ روپے“ جلال الدین کو صدمہ پہنچا۔ ”پندرہ روپے کیسے میاں؟“
”چلتے بیٹھ جائیے نا۔ آباجی“ نزہت آس پاس سے گزرنے والوں کی ٹوٹتی نگاہیں
میں گھر کر بولی۔ ”یہ جاتو رہا ہے۔ دوسروں نے تو صاف انکار کر دیا ہے۔“
”زیادتی ہے“ جلال الدین نے میکی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔
عابدہ بیگم اور نزہت کو پھلی سیٹ پر بٹھا کر اور صندوقچے کو گماڑی کی چھت پر
رکھ کر وہ ڈرائیور کے پلو والی سیٹ پر آبیٹھا۔ ”چلتے حضور“ وہ بولا۔
”معلوم ہوتا ہے آپ اس شرمیں پہنچی نہیں آتے۔“ ڈرائیور نے ایک موڑ
کاٹتے ہوئے کہا۔

”لو! ارے بھائی میں تو رجنوں بار آیا ہوں۔“ جلال الدین ہنسا۔ پھر مُرکر عابدہ بیگم
اور نزہت سے کہنے لگا۔ ”یہ بھائی ہمیں ہمارے میئے بساں سے گنوار سمجھ رہا ہے
شاید“ پھر وہ ڈرائیور کو منا طلب کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم ڈھاکے سے آرہے ہیں بھائی۔“

”ڈھاکے سے؟“ ڈرائیور یوں حیران رہ گیا جیسے ڈھاکہ مرتبخ کا کوئی شہر ہے۔ پھر اس نے کار کو سڑک کے کنارے لے جا کر روک لیا، سٹینگ پر سے ہاتھ اٹھا کر انہیں جوڑا اور بڑی عاجزی سے بولا۔ ”مجھے معاف کر دیجئے بھائی صاحب۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ وہاں سے آ رہے ہیں۔ وہاں سے آنے والوں کو تو ہمیں انکھوں پر بھانا چاہیئے۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے درد نہ میں کوئی ایکسیڈنسٹ کر بلکہ انکھوں گا۔“

خوشی کے مارے جلال الدین کی انکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ڈرائیور کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو اپنے دلوں ہاتھوں میں لیا اور اس کی انکھوں میں انکھیں ڈال کر مسکرنے لگا اور پھر ڈرائیور سے یوں پیٹ گیا جیسے ہوائی اڈے پر اترنے سے لے کر اب تک وہ اسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ پھلی سیٹ پر عابدہ بیگ اور نزہت مسکرا بھی رہی تھیں اور رو بھی رہی تھیں۔ ڈرائیور نے آستین سے اپنے آنسو پوچھے، کار شارٹ کی اور جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ”ہم بھی کیسے چھوٹے کیسے کہنے لوگ ہیں۔ جو بھی سواری ملتی ہے، اسے لوٹنے کی تاک میں رہتے ہیں۔ یہ سوچنے کی توفیق نہیں کہ یہ جو شخص کسی لینے آیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی مر گیا ہو، یہ اپنے کسی پیارے کے جنازے میں پہنچنا پاہتا ہو، اس کا پچہ بیویش پڑا ہو اور یہ ڈاکٹر سے دواليئے جارہا ہو، ہم بھی کیسے بد نصیب لوگ ہیں جو اپنے بچوں کے پیٹ بھرنے کی خاطر دوسروں کے بچوں کے پیٹ کاٹ لیتے ہیں؟“ ڈرائیور ڈک کر وہ جلال الدین سے منا طلب ہوا۔ ”آپ مجھے معاف نہ کر دیتے تو پتہ ہے میں کیا کرتا۔ میں آپ کو پہنچا کر سیدھا ہار لیوے سیشن جاتا اور وہاں کسی گاڑی کے نیچے سر رکھ دیتا۔“

”توبہ کرو بھائی، کبھی باقی کرنے ہو۔“ جلال الدین نے بظاہر بڑی اداسی سے ڈرائیور کا کندھا تھپتھپایا۔ مگر وہ اندر سے کتنا آسودہ تھا! پاکستان آغرا سے متعارف ہو رہا تھا!

ڈرائیور اپنی دھمن میں بولتا ہی چلا گیا۔ ”آپ لوگ ڈھاکے سے آ رہے ہیں جہاں قیامتیں گزر گئیں۔ پتہ نہیں آپ کہاں کہاں سے لٹ کر اپنے پاکستان پہنچے اور یہاں میں۔۔۔ ایک لیٹرا۔۔۔ آپ کی تاک میں بیٹھا تھا کہ آپ کی ہڈی پر اگر کوئی بُٹ رہ گئی ہو تو اسے بھی فوج لوں۔ لعنت ہو مجھ پر۔“

”آب اور شرمندہ نہ کرو۔“ جلال الدین شرمندہ ہونے کی بجائے باغ باغ ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہم وطنی بھی کیسا عجیب رشتہ ہوتا ہے۔ ایک وہ ڈھاکے کے ہم وطن نہیں، ایک یہ ٹیکسی ڈرائیور ہے!

مرزا طاہر بیگ کے گھر کے سامنے جب ٹیکسی رکی اور ڈرائیور نے چھت پر سے صندوقچہ انداز تو جلال الدین نے عابدہ بیگم اور نزہت کے لئے کار کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے پندرہ روپے ادا کرنے کے لئے جیب میں ہاتھ دالا تو ڈرائیور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”نہیں صاحب یہ نہیں ہو گا۔“ وہ بولا۔ ”اگر آپ میرے سینے میں گھونپنے کے لئے جیب میں سے چاقون کانے لگے ہیں تو میں آپ کا ہاتھ چھوڑ دوں گا، لیکن اگر آپ کرایہ نکالنے چلے ہیں تو میں آپ کو یہ نہیں کرنے دوں گا۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا تو میرا کرایہ مجھے مل گیا۔“

آس پاس سے لوگ یہ دیکھ کر جمع ہونے لگے کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور اور مسافر کسی بات پر الجھ پڑے ہیں۔ اچھا خاصا ہجوم ہو گیا۔ تب طاہر بیگ گھر سے باہر آیا اور جلال الدین کو سینے سے بھیچ کر اٹھا لیا دونوں ہنس بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔ پھر جلال الدین نے طاہر کا ہاتھ پکڑا اور اسے عابدہ بیگم اور نزہت کے پاس لے آیا۔ ابھی دوچار ہی باتیں ہوتی تھیں کہ جلال الدین دشست زدہ ہو گر پڑا۔ ڈرائیور موقع پا کر اچانک ٹیکسی بھگا لے گیا تھا۔ جلال الدین چند قدم اس کے پیچے بجا گا۔ پھر رُک گیا اور جیسے سارے ہجوم کو مناہل کر کے بولا۔ ”وہ ایک اصلی پاکستانی جارہا ہے۔۔۔ سچا اور کھرا ہے۔“

طاہر بیگ کے قریب آکر اس نے سارا واقعہ سنایا۔ لوگوں نے یہ واقعہ یوں
سانس روک کر سنایا جیسے الف بیلڈ کی کھانی سُن رہے ہیں۔

اچانک طاہر بیگ کو محسوس ہوا کہ مستورات بہت دیر سے محلے کے ہجوم
میں گھری کھڑی ہیں۔ یہ سب میرے محلے دار ہیں، سب میرے بھائی ہیں؛ وہ انہیں
اندر لے جاتے ہوتے ہوئے بولا، مگر پھر کہ گیا اور، ہجوم سے مخاطب ہوا یہ معاف کیجئے گا،
یہ میرے بہت عزیز دوست جلال الدین ہیں۔ یہ مشرقی پاکستان سے لٹ پٹ کر
آ رہے ہیں۔ ڈھانی تین میں سے پہلے ڈھاکے سے نکلنے تھے اور اب جانے کماں کماں
سے ہوتے ہوتے یہاں پہنچے ہیں۔ جب آزادیاں ختم ہوتی ہیں تو راستے لمبے ہو جاتے
ہیں۔ یہ لوگ ڈھاکے میں ایک بھرا پرا گھر جھوڑ کر اس صندوقچے کے ساتھ یہاں آتے
ہیں۔ یہ طاہر بیگ نے جلال الدین کے ہاتھ سے صندوقچہ چھین کر اسے بلند کیا۔
ہجوم میں سے ایک بولا یہ شاید انہی کے لئے آپ نے وہ والا فلیٹ کرائے
پر لیا ہے؟“

”جی ہاں، انہی کے لئے طاہر بیگ نے جواب دیا۔ ”مجھے کھٹمنڈو سے اون کا خط
لاتومیں نے فوراً ایک مکان کا بندوبست کر لیا۔ یہ سب کچھ میں نے اس لئے عرض
کیا ہے کہ اب جلال الدین بھی بیسیں رہیں گے۔ اگر وہ اس شہر میں رہیں گے تو پھر
اسی کاونی میں رہیں گے۔ ہم انہیں اور کہیں نہیں جانے دیں گے۔ پھر میں نے یہ
تعارف اس لئے بھی کرایا ہے کہ مشرقی پاکستان سے آنے والے ہمارے بھائی
ہم سب کی محبتوں کے مسحتی ہیں۔ یہ ایک بھٹی میں سے تپ کر کندن بن کر نکلنے
والے پاکستانی ہیں۔“

ہجوم میں سے ایک بزرگ بولے ”اللہ انہیں برکت دے۔ خدا ہمیں ان
کے زخم مند مل کرنے کی توفیق دے۔“

اس بات پر نزہت بیکا یک بچے کی طرح بک کر رو دی اور جلال الدین اسے سنبھالنے کو لپکا۔ پھر اداس، ہجوم منتشر ہونے لگا اور طاہر بیگ تینوں کو اندر لے آیا۔ طاہر بیگ کی بیوی اور بیٹیاں عابدہ بیگم اور نزہت سے پست پست گئیں اور دیر تک رونے رُلانے کا دور چلا۔ پھر سب نے مل کر کھانا کھایا اور طاہر بیگ نے جلال الدین کو بتایا کہ اس وقت اس کے مکان میں مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے تین خاندان موجود ہیں درندہ جلال الدین کو اپنے گھر میں رکھتا اور کرتے پر مکان لینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ”بہر حال“ طاہر بیگ بولا۔ یہ فلیٹ ہیں قریب ہے۔ بس کوئی ایک پون فرانگ کا فاصلہ ہو گا۔ دوسرا منزل ہے، دو مرے ہیں، کچن ہے، باخند ہے۔ بجلی، پانی، گیس سب کچھ ہے۔ تم جب تک یہاں کوئی ملازمتیا کار و بار شروع نہیں کرتے، یوں سمجھو کر یہ کرتے کامکان میرا مکان ہے۔ یعنی تمہارا مکان ہے۔“

کھانے کے بعد طاہر بیگ نے ملازم سے صندوقچہ اٹھوایا اور تینوں کو ان کا نیا گھر دکھانے لے چلا۔ یہ تھا تو ایک معمولی سافلیٹ مگر طاہر بیگ کی محبت نے اسے چکا دیا تھا۔ تین نتے پلنگوں پر نتے بستر لگے تھے۔ غسل خانے میں تو یہ صابن تک موجود تھا۔ کچن میں تمام ضروری برتن بچے تھے اور سوتی گیس کا نیا چولہا جیسے نتے ماکوں کی خاطر بنائھنا بیٹھا تھا۔ جلال الدین نے یہ سب کچھ دیکھا تو ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں ڈب دبا آئیں اور وہ تشكیر کا کوئی لفظ کہنے لگا تو اس کا گلہ رندہ گیا۔ طاہر بیگ نے اسے سینے سے لگایا۔ پھر سب کو آرام کرنے کو کہا اور تاکید کی کہ پانچ چھ بجے وہ اس کے ہاں آگر چاٹے پہنیں اور پھر رات کا کھانا کھائیں۔ جب تک ملازم تمہارے گھر کے لئے ایک مہینے کا سودا سلف بھی لے آئے گا اور میرا سارا گھر کل کا کھانا تمہارے ہاں کھائے گا۔ کیوں نزہت بیٹی؟“

”جی بسم اللہ“ نزہت خوش ہو کر بولی۔

طاہر بیگ کے جانے کے بعد دنیوں اپنے اپنے پنگوں پر جیسے بت بنے
بیٹھے رہے۔ پھر جلال الدین نے اپنی آنکھیں پوچھیں اور پنگ پر دراز ہو کر بولا۔
”ٹھیک ہے۔ حالات نے ہمیں بوٹ لیا مگر طاہر نے پورے پاکستان کی نمائندگی کر دی
ہے۔ اس کے بتاؤ نے میرے تو سب زخم مندل کر دیئے ہیں۔“

”سب زخم آباجان ہے“ نزہت نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ پھر آنسو اس کی آنکھوں
سے چھکا کر اس کے پھرے پر دوڑنے لگے۔ ”سب کے سب زخم مندل ہو گے
آپ کے ہے کوئی ایک بھی نہیں بچا ہے“ رونے پر ضبط کرنے کی خاطرا اس نے سخنے ہونٹ
کو دانتوں میں دبایا۔ اس نے پس کھولا، اشرف کی تصویر نکالی اور جلال الدین کو
دکھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ زخم بھی آباجان ہے“

”نزہت بیٹی ہے“ جلال الدین ترپ کر اٹھا۔ عابدہ بیگم بھی نزہت کی طرف
بڑھی۔ اب اپنے آپ کو سنجھا لو میری بچتی۔ اس نے نزہت کو پٹالیا۔ پھر دونوں
نزہت کے دامیں باہم بیٹھ گئے۔ وہ اس کے سر اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے رہے مگر
زبان سے کچھ نہ بولے۔ وہ جانتے تھے کہ نزہت کے زخم کا انداز مال مشکل ہے۔
خاصہ و قفع کے بعد عابدہ بیگم کو گفتگو کا ایک موضوع سوچا۔ وہ ان غیر ملکی ایک
ہوسٹس کی باتیں کرنے لگیں جو اشرف کی تصویر لے گئی تھیں اور جنہوں نے وعدہ
کیا تھا کہ وہ ڈھا کے کی ہر فلات پر اشرف کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گی۔

”آپ تو میری والی تصویر بھی انہیں دینے لگی تھیں“ نزہت نے طنز آکھا
اگر آپ دے ڈائیں۔۔۔ اگر آپ مجھ سے یہ تصویر بچھیں لیتیں تو پتہ ہے کیا
ہوتا ہے میرے لئے اشرف سچی بھی مر جاتا۔“

نزہت اب کے تو بالکل ٹوٹ کر رو دی۔ بہت دیر تک جلال الدین اور

عبدہ بیگ اسے بدلانے کی کوشش کرتے رہے اور اس کوشش میں خود بھی روتے رہے۔

پھر جب تینوں طاہر بیگ کے ہاں جانے کے لئے تیار ہوتے اور نزہت نے پس اٹھایا تو عبدہ بیگ نے اسے ٹوکا۔ چار قدم پر تو جانا ہے بیٹی، اور تم پر س لئے آرہی ہو۔ کچھ عجیب سالگتا ہے۔ پرس کو صندوق پتے میں رکھ دو اور صندوق پتے کا تالا آتاری لاو۔ باہر کے دروازے میں لگائیں گے۔

نزہت نے ایک پل سوچا۔ پھر بولی۔ ”جی اچھا۔ پٹ کر پرس صندوق پتے میں رکھا اور صندوق پتے کا تالا کھوں کر دروازے تک آئی۔ تالا لگاتے ہوئے اس کا ٹھڑک گیا۔“ امی؟ وہ بولی۔ ”پرس تو چلو نہیں لاتی۔ سچ مجھ اچھا نہیں لگتا۔ پر آپ کیس تو تصویر نکال لاؤں؟“

”تو تو بیٹی کچھ کچھ پاگل ہو رہی ہے میری طرح۔“ جلال الدین نے اسے پیارے ڈانٹا۔ اس کے ہاتھ سے تالا کے کر دروازے میں لگایا، چابی جیب میں ڈالی اور تینوں طاہر بیگ کے مکان کی طرف چل پڑے۔

چاتے اور پھر کھانے کی میز پر خوب مزے مزے کی باتیں ہوتیں رہیں۔ طاہر بیگ نے اپنی بیوی بیٹیوں کو سمجھا دیا تھا کہ ڈھاکے کا کوئی ذکر نہ آنے پاتے۔ وہ اپنے شر کی بھیر بھاڑ اور گھاگھری کی باتیں کرتا رہا اور طاہر بیگ کی اس بات نے تو نزہت تک کو ہنسا دیا کہ جب پہلی بار اس شہر میں آنے والے ایک صاحب ریلوے ٹیشن سے نکلے اور شہر میں داخل ہوتے تو انسانوں اور مریفیک کے انبوہ کثیر کو دیکھ کر اپنے میزبان سے نہایت معصومیت کے ساتھ پوچھا یہ کیوں صاحب یہ شہر خالی کیوں ہو رہا ہے؟“

مطلوب شام ہی کو جلال الدین کے گھر کے لئے مینے بھر کا سودا سلف خرید لایا

تھا۔ عابدہ بیگم اور نزہت کو دیں چھوڑ کر طاہر بیگ نے جلال الدین اور ملازم کو ساتھ لیا اور سماں پہنچانے فلیٹ کی طرف چلا۔

فلیٹ میں روشنی ہو رہی تھی۔ جلال پسے توحیران ہوا، مگر پھر یہ توجیہ کر لی کر ٹوپیں گھروں کے معاملے میں بہت محتاط اور دور اندیش ہوتی ہیں اور عابدہ یا نزہت نے تالار گانے سے پہلے بھلی جلا دی ہو گئی، مگر حب سیڑھیاں چڑھ کر جلال الدین تالاکھو لئے کے نئے جھکا تو ایک لمحے تک بھکارہ اور پھر نیچے بیٹھ گیا۔

«کیا ہو جلال؟» طاہر بیگ نے گھرا کر پوچھا۔

اور جلال الدین نے فرش پر سے تائے کے دمکٹے چن کر سختی پر رکھے اور سختی کو بند کر دیا۔ طاہر بیگ دیوانوں کی طرح دروازہ کھول کر اندر لپکا۔ پنگوں پر سے بستر غائب تھے۔ کچھ میں برتن چو لھے سمیت غائب تھے۔ غسل فانے میں تو لیتھا غائب تھا۔ طاہر بیگ اور جلال الدین جیسے سناٹے میں آکر ایک کمرے کے وسط میں گڑ سے گئے تھے۔ ملازم میں بھر کا سودا سلف ایک کونے میں رکھ کر واپس جا چکا تھا۔ پھر طاہر بیگ نے جلال الدین کا ہاتھ پکڑا اسے محنت سے دبایا اور بولا۔

«تم کیوں اداں ہو جلال؟ چوری تو میری ہوتی ہے۔»

جلال الدین کے اندر تبتہک دکھ کا ایک طوفان جمع ہو چکا تھا۔ اس نے طاہر بیگ کو سینے سے لگایا اور زور زور سے رونے لگا اور طاہر بیگ بھی جلال الدین سے کچھ کہ نہیں پایا تھا کہ دروازے پر نزہت نمودار ہوتی۔ وہ وہاں ذرا سار کی اور پھر ایک پنگ کی طرف پکی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر وہ پنگ کے نیچے رکھے ہوئے صندوق پر جھٹپٹی، اسے کانپی طرف گھسیٹا اور پھر اسے اس دھشت سے کھولا کر ڈھکنا ٹوٹ کر انگ جاگرا۔

تب عابدہ اور طاہر بیگ کی بیوی اور بیٹیاں بھی ہانپتی ہوتی آنکھیں۔ سب

نہت کی طرف بڑھیں جو صندوق پر کھونے کے بعد جیسے تھربن گئی تھی۔
کھلے صندوق میں میدے کپڑے جوں کے توں رکھے تھے، صرف نہت کا
پرس فاسب تھا۔

نہت، خشک دیران آنکھیں خلام میں گاڑے یوں بیٹھی تھی جیسے وہ ڈھاکے
میں بیٹھی مکتی باہنی والوں کے قدموں کی چاپ سن رہی ہو۔
پھر جلال الدین نے ”بیٹی، بیٹی“ پکارتے ہوتے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر
جھنچھوڑا اور بولا۔ ”پرس میں کیا تھا، بیٹی۔ تصور یہ تھی نا اشرف کی۔ پھر جب خدا کے فضل
سے خود جیتا جا گتا اشرف ہمارے پاس سامنے آجائے گا تو۔۔۔“

”آپ کو پتہ نہیں آیا جی۔“ نہت بہت پراسرار انداز میں، جیسے راز کی کوئی
بات بتاتی ہوئی بولی۔ ”ہم ابھی تک ڈھاکہ میں ہیں۔ اور اشرف سچ مجھ مر گیا ہے اور
مارنے والے اس کی لاش بھی اٹھا کر لے گئے ہیں۔“

عالال

آماں ابھی وہی بلور ہی تھیں کہ وہ مٹی کا پایا لئے آنکلی۔ یہ دیکھ کر کہ ابھی مکھن ہی نہیں
نکالا گیا تو لستی کہاں سے ملے گی، وہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ واپس چلی جاتے یا وہیں
کھڑی رہے۔

”بیٹھ جاؤ عالال؟“ آماں نے کہا۔ ”ابھی دیتی ہوں — کیسی ہو؟“

”جی ابھی ہوں۔“ وہ وہیں بیٹھ گئی جہاں کھڑی تھی۔

کچھ در کے بعد آماں بولیں: ”اب میں مکھن نکالنے لگی ہوں۔ بُرا نہ ماننا نیت بُری
نہ بھی ہو تو نظر لگ جاتی ہے۔ ابھی اپنے دنوں نوکر نے مجھے مکھن کا پیڑا نکلتے دیکھا
تھا تو دوسرے دن مرغی کے انڈے کے برابر مکھن نکلا، اور اس سے اگلے دن چڑیا کے
انڈے کے برابر گائے کوئین دن مرچوں کی دھونی دی تو نظر اُتری:“

عالال گلکھی: ”نظر تو کبھی کبھی میری بھی لگتی ہے بی بی جی۔ اس سے پہلے آپ کا

شیشے کا ایک گلماں توڑ چکی ہوں؟“

”ہاں ہاں؟“ آماں کو یاد آگیا: ”تم نے کہا۔ ہاتے بی بی جی۔ کیسا صاف شفاف ہے
کہ نظر آر پار جاتی ہے اور پھر لوں ہی پڑے پڑے ٹھیں سے ٹوٹ گیا۔ میں تو حیران
رہ گئی۔“ پھر انہوں نے عالال کو ڈالا۔ مگر اس ڈالنٹ میں غصہ نہیں تھا۔ ”وابادھر

پر لی طرف دیکھو۔“

اور وہ مسکراتی ہوئی ایک طرف کو گھوم گئی اور سامنے دیکھنے لگی۔ سامنے میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوپٹے کا پوسٹر پر کھینچ کر ماتھے تک لے آئی اور بولی

”بی بی جی، اندھوٹے میاں جی تو نہیں بیٹھے ہے؟“

”ارمی وہی عارف ہی تو ہے؟“ اماں بولیں۔ ”رات آیا ہے۔“

عالاں اٹھ کر دروازے تک آئی اور بولی۔ ”رد بلا یں، دُور بلا یں۔“
”کبیسی ہو عالاں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی اچھی ہوں۔“ وہ بولی۔ پھر اس کے چہرے پر شراحت چمکی۔ ”پہلے تو میں آپ کو پہچانی ہی نہیں۔ میں سمجھی کوئی بچھہ موخچیں لگاتے بیٹھا ہے۔“
اس پر آماں کو سننی چھوٹ گئی۔ ”توہہ ہے؟“ وہ بولیں۔ ”کم بخت ایسی بات کرتی ہے کہ — توہہ سے!“

عالاں دہیز پر یوں بیٹھ گئی کہ اس کا ایک پاؤں باہر صحن میں تھا اور ایک کمرے کے اندر نشست کے اس اندازے نے اس کی نیلی تہمینہ کوتان کر اس کی آدھی پنڈلیوں تک اٹھا دیا تھا۔ اس کے میلے پاؤں کے مقابلے میں اس کی پنڈلیوں کا رنگ کتنا مختلف تھا! اور یہ پنڈلیاں کتنی سڑوں تھیں! یونانیوں نے ویس کے بت کی جو پنڈلیاں بنائی تھیں، وہ کیا عالاں کی پنڈلیاں دیکھ کر بنائی تھیں!

”عارف میاں، پر دیں میں آپ کیا کرتے ہیں؟“ اس نے مجھ سے یوں پوچھا جیسے چوپاں میں بیٹھی گپ لڑا رہی ہے۔ ساتھ ہی وہ مٹی کے پیالے کو فرش پر ایک انگلی سے سلسیل گھما تے جا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”نوكری کرتا ہوں۔ روپیہ کاما تا ہوں۔“

”بی بی جی کو کتنا بیکھنے پیں؟“ اس نے شراحت سے مُسکرا کر پوچھا۔

”اے لڑکی!“ آماں نے اسے ڈانٹا۔ ”اپنی عمر کے لڑکوں سے یوں باتیں نہیں کرتے۔ اب تو چھوٹی نہیں ہے کیا ابھی تک تجھے کسی نے نہیں بتایا کہ تو طبی ہو گئی ہے؟“ وہ دہلیز پر بیٹھی بیٹھی آماں کی طرف گھوم گئی۔ اب اس کے دونوں پاؤں صحن میں تھے اور بالوں کا ایک ڈھیر کمرے میں تھا۔ ”کون بتائے بی بی جی؟“ وہ بولی۔ ”آماں آبا ہوتے تو بتاتے۔ اس نہیں تو خدا کے پاس جانے کی اتنی جلدی پڑی تھی کہ میرے سر پر سے اپنا ہاتھ اٹھایا تو یہ انتظار بھی نہیں کیا کہ کوئی اس لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھنے تو چلیں؟“ عالاں کی آواز کو آنسوؤں نے بھگو دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”عالاں تمہاری ماں تو کب کی چل بسی کیا باپ بھی چل دیا؟“ اب کے گھوم کراس نے دونوں پاؤں کمرے میں رکھ دیئے اور بولی۔ ”جی۔ دُہ بھی چلا گیا۔ میں لڑکا ہوتی تو شاید مجھے جوتا گا نہ ٹھنا سکھا جاتا۔ پردہ مجھ سے روٹیاں ہی کپوٹا رہا اور پانی ہی بھروتا رہا۔ اب میں ایک موچی کی بیٹی ہوں پر اپنے جوتے دوسروں سے مرمت کراتی ہوں۔“

”تو کیا ہوا؟“ آماں بولیں۔ ”تجھے صرف جوتے گا نہ ٹھنا نہیں آتے نا۔ باقی تو سب کام آتے ہیں۔ اپنی محنت سے کماتی اور کھاتی ہو۔ سارا گاؤں تمہاری تعریف کرتا ہے۔—لوستی لے لو۔“

عالاں جو آماں کی گفتگو کے دران انہی کی طرف گھوم گئی تھی، اٹھی اور جا کر پایالم آماں کے پاس رکھ دیا۔

وہ لستی کا پایالم کے کر جائے گئی مگر چند قدموں کے بعد ایک دم رک گئی اور پڑ کر بولی۔ ”آج بھی حکی پیسے آجاؤں بی بی جی؟“

”آجانا، آجانا!“ آماں بولیں۔ ”آماں تو ڈھیروں پڑا ہے پر عارف کے آبا کی برسی بھی تو زیادہ دور نہیں ہے۔ کئی بوریوں کی ضرورت پڑے گی۔ آجانا!“

”جی اچھا۔“ وہ بولی۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے مجھ سے پوچھا۔ ”عارف میاں آپ
کتنی پھٹی پر آتے ہیں؟“
میں نے کہا: ”میں آتا کی بر سی کر کے جاؤں گا۔“
بولی۔ ”پھر تو بہت دن ہیں۔“

میں جب گاؤں میں ادھر ادھر گھوم کر دا پس آیا تو وہ اندر ایک کوٹھریا میں
بیٹھی چکی میں رہی تھی۔ اور وہنی اس کے سر سے اُتر گئی تھی اور کھلے بال چکی کے ہر چکر کے
ساتھ اس کے چہرے کو چھپا اور کھول رہے تھے۔ اس نے ایک ٹانگ کو پورا پھیلا
رکھا تھا اور نیلا تھبندہ اس کے گھٹنؤں تک کھینچ گیا تھا۔ اگر ایسی پٹلی کو کاٹ کر اور
شیشے کے مرتبان میں رکھ کر ڈرائینگ روم میں سجا دیا جائے تو کیسار ہے!
میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ آماں کہیں نظر نہ آئیں تو میں پنجوں کے بن کوٹھریا کے
 دروازے تک گیا۔ دروازے سے آتی ہوتی روشنی ایک دم کم ہوتی تو اس نے چونک
 کر دیکھا۔ چکی روک لی۔ بالوں کو جھٹک کر سیٹا اور اور وہنی کو سر پر کھینچ لیا مگر پھیلی ہوتی
 ٹانگ کو پھیلا رہنے دیا۔ پھر وہ چکی کی ہتھی کو تھام کر اسے آہستہ آہستہ گھمانے لگی اور
 میری طرف دیکھتی چلی گئی۔

اس وقت میرا پلاٹ اسٹری ہتھا کہ ایک موچی کی بیٹی کی آنکھوں کو اتنا بڑا نہیں ہوتا
 چاہیتے۔ غریب غرباً کوچھ بھوٹی بھوٹی آنکھیں ہی کفایت کر جاتی ہیں۔

اس کے چہرے پر شرارت تھی اور اس ڈر کے مارے کے دوہ کوئی نفرہ نہ مار
 دے، میں نے پوچھا۔ ”آماں کہاں ہیں؟“

وہ بولی۔ ”تو کیا آپ بی بی جی کو دیکھنے یہاں تک آتے تھے؟“

”تو کیا نہیں دیکھنے آیا تھا؟“ مجھے جملے کا موقع مل گیا۔

اس نے بس اتنا کیا کہ ٹانگ سنبھلی اور پھر چپلا دی۔ پھر وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی
کہ میں نے پھر لوچھا۔ ”آماں کہاں ہیں؟“
”یہیں جو یہیں میں ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کے چھاکی بیٹھی بیمار ہیں۔ انہیں دیکھنے
گئی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ جو تم پساتی کر رہی ہو، اس کی کتنی اجرت لوگی؟“
”دو دن کا آٹا تو مل ہی جلتے گا۔“ اس کے لہجے میں کاٹ سی تھی۔ زندگانے طنز
کر رہی تھی یا اس کا لمحہ ہی ایسا تھا۔

”اچھا دو دن گزر گئے تو پھر کیا کرو گی؟“
”وپھر آجاوں گی آٹا میسے یا پانی بھرنے یا چھتیں لیںے؟“
”چھتیں لیںے؟ کیا تمہیں چھتیں لینا بھی آتا ہے؟“ میں نے سچ مجھ حیرت سے پوچھا۔
اور وہ بولی۔ ”مجھے کیا نہیں آتا عارف میاں۔ بس ایک جو تے گانٹھنے نہیں آتے۔
اور بہت کچھ آتا ہے۔“

”مشلاً اور کیا کیا آتا ہے؟“ میں نے شرارت سے پوچھا۔
”اور۔۔۔ اور۔۔۔“ وہ کچھ بتانے لگی تھی مگر جیسے سوچ میں پڑ گئی اور آخر
بولی۔ ”سبھی کچھ آتا ہے۔ آپ دیکھ لیں گے ہو لے ہو لے۔“ چند لمحے وہ یوں چکنے
میں منصرف رہی جیسے مجھے بخوبی لگئی ہے۔ پھر کچھ روکی۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور دوسرے
کی طرف بڑھی۔ میں ایک طرف ہٹا تو وہ باہر آگئی اور بولی۔ ”پیاس لگی ہے پربی بی جی
کا کٹورا جھوٹا ہو جائے گا۔ مجھے مبک میں پلا دتیجئے۔“

”تم کٹو رے ہی میں پی لو۔“ میں نے کہا اور پھر دانت کے لہجے میں کہا۔ ”چلو،
اٹھاؤ کٹورا۔ پیو پانی۔“

اس کی مسکراہٹ کتنی گلابی تھی۔ زندگی میں پہلی بار انکشاف ہوا کہ مسکراہٹ

کا بھی رنگ ہوتا ہے۔

وہ پانی پی چکی تو کٹورے کو کھنگالنے کے لئے اس میں ذرا سا پانی ڈالا۔ میں نے کہا: ”بھر دو کٹورا۔“ وہ سمجھی شایدی میں کٹورے کو پوری طرح پاک کانا چاہتا ہوں۔ کٹورا بھر گیا تو اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے کٹورا اس کے ہاتھ سے اچک کر منہ سے لگایا۔ ”عارف میاں جی!“ وہ انتہائی حیرت اور صدمے سے بولی۔ ”وہ حواس باختہ سی، میری طرف دیکھتی رہی۔ اور جب میں نے خالی کٹورا واپس کیا تو اس کے ہاتھ میں رعشہ تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی کی ایک چکلی تہ نمودار ہو گئی تھی اور اس نے اڑھنی کو یوں کس کے پیٹ لیا تھا جیسے نماز پڑھنے چلی ہے۔

گاؤں میں جوان لڑکی کا ایک ایک قدم گنا جاتا ہے، ایک ایک نظر کا حساب رکھا جاتا ہے۔ بہت سے دوست بیٹھے تھے۔ لڑکیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ فلاں، فلاں کے ساتھ ہے۔ فلاں فلاں کے پیچے ہے، فلاں انعام ہونے کے انتظار میں ہے۔ فلاں اتنے ہاتھوں سے گوری ہے کہ اس بھری جوانی میں بھی پرانی ہو گئی ہے۔ میں نے کہا: ”ایک لڑکی عالاں بھی تو ہے، نادرے موجی کی بیٹی؟“ اس پر سب ہنسنے لگے ”وہ؟“ انہوں نے کہا: ”وہ کسی کام کی نہیں ہے۔ گھر میں کام کرتی بھر رہی ہے۔ روپیہ کمار رہی ہے۔ خوبصورت ہے پر نکمی ہے۔ ایک بار بیگو موچھیل نے چھپڑا تو بولی۔ ”میں موجی کی بیٹی ہوں۔ کھال آتا لیتی ہوں!“ بیگو کو اتنی شرم آئی کہ سیدھا نانی کے پاس گیا اور موچھوں کی نوبیں کٹوادیں!“ سب ہنسنے لگے اور دیر تک ہنستے رہے۔

میں نے کہا: ”اگر وہ اتنی محنتی لڑکی ہے تو اس کی عزت کرنی چاہیتے؟“ ایک بولا۔ ”وہ عزت بھی تو نہیں کرنے دیتی!“

اس پر سب کو ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔
دوسرے بولا، ”تمارے ہاں تو وہ بہت کام کا ج کرتی ہے۔ کبھی اس کی عزت کر کے
وہ کیوں کھال آتا رہے گی؟“

وہ پھر ہنسنے لگے اور مجھے ان کی ہنسی میں مشرک ہونا پڑا اگر مجھ سے اپنی ہنسی کی
آواز پہچانی ہی نہیں گئی۔ — بالکل ٹین کے غالی کنسترویں کنکر بنجنے کی آواز!
میں گھر والپس آیا تو وہ دروازے سے بالکل رہی تھی۔ چہرہ بالکل تپا ہوا تھا۔ آنکھیں
بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ میں چون کھا اور پوچھا، ”کیا بات ہے عالاں؟ روتنی رہی ہو؟“
وہ ہنسنے لگی۔ پھر ہنسی کے وقفوں میں بولی۔ ”روئیں میرے دشمن۔ میں کیوں
روؤں۔ میں تو مرچیں کوٹ لیتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”کوئی ایسا کام بھی ہے جو تمہیں
کرنا نہ آتا ہو؟ تم اتنے بہت سے کام کیوں کرتی ہو عالاں؟“

وہ بولی۔ ”روپیہ کارہی ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں روپے والے لوگ غریب لڑکیوں
کو خرید لیتے ہیں۔ میرے پاس روپیہ ہو گا تو مجھ پر نظر اٹھانے کی کسی کو مجال نہیں ہو گی۔ ہے
کسی کی مجال؟“ — پھر وہ میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولی۔ ”میں نے آپ کے
کرتے کے لئے ممل خریدی ہے۔ اس پر بیل بوٹے کاڑھ رہی ہوں۔“

”یہ غلط بات ہے۔“ میں نے احتیاج کیا۔ ”تماری محنت کے کام سے ہوتے
روپے سے خریدا ہواؤ کرتا مجھے کاٹے گا۔“

”میں کسی کو تباوں گی تھوڑی؟“ وہ بولی۔ ”آپ بھی نہ بتائیئے گا۔ پھر نہیں کاٹے
گا۔“ وہ لگنگی۔ پھر ایک دم گھبرا گئی۔ ”ہائے میں مر جاؤں، کہیں بی بی جی تو نہیں ہوں رہی ہیں۔“
”بی بی جی“ کے لفظ پر میرے جسم میں بھی سنسنی دوڑ گئی۔ اندر جہان کا تو صحن خانی
تھا۔ پھر ملپٹ کر دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔

ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا۔ اچھی لڑکی ہے۔ پیاری بھی ہے۔ شوئخ بھی ہے۔ سب کچھ ہے مگر موچی کی لڑکی ہے اور خاندان کے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ بلندی پر کھڑے ہو کر گھرے کھڈ میں نہیں جھانکنا چاہیتے۔ توازن بگڑ جاتا ہے اور آدمی گر جاتا ہے۔

آباکی برسی کے روز ہمارے ہاں پورا گاؤں جمع تھا مگر اس ہجوم میں بھی عالاں کی دوڑ بھاگ نمایاں تھی۔ وہ پھر کی طرح گھومتی پھر رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اگر یہ لڑکی اس ہجوم سے نکل گئی تو برسی کی ساری تنظیم بگڑ جاتے گی اور ہر طرف لٹش پر چلاتے گی۔ وہ بالکل برے کی طرح ہجوم میں سے راستہ بناتی ہوتی پا رہو جاتی اور پلٹ کر غڑاپ سے امی کے کمرے میں گھس کر کواڑ و صڑ سے بند کر دیتی۔ وہاں سے ہدایات لے کر وہ پھر باہر نکلتی اور پھر سے ہجوم میں برما گاڑیتی۔ عشاء کی اذان تک سارا گاؤں کھانا کھا چکا تھا۔ خالی دیکھیں ایک طرف سمیٹ دی گئی تھیں۔ ناقی، میراثی، دھوبی، موچی بھی فارغ کر دیتے گئے تھے۔ دن بھر کے ہنگامے کے بعد ایک بہت بھاری سناٹاگھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ آخری ہمان کو رخصت کر کے جب میں امی کے کمرے میں آیا تو مجھے یقین تھا کہ عالاں بھی امی کے بازو اور پنڈلیاں دبارہ ہو گئی۔ مگر امی تو اکیلی بیٹھی تھیں۔ زندگی میں شاید پہلی بار امی کا لحاظ کئے بغیر میں ان سے پوچھ بیٹھا۔ ”عالاں کہاں ہے؟“

مگر امی اس سوال سے بالکل نہیں چونکیں۔ بولیں۔ ”وہ لڑکی ہیرا ہے بیٹا۔ بالکل ہیرا۔ آج تو وہ میری آنکھیں میرے بازو، میرا سب کچھ تھی۔ دن بھر کی تھکی ماندی تو تھی، ہی، کھانے بیٹھی تو دو چار نو لوں کے بعد جبی بھر گیا۔ اٹھ کر جانے لگی تو میں نے اسے روکا۔ اس دیگھی کو چاولوں سے بھرا اور اسے لے جانے کو کہا تو وہ بولی ٹیر چاول تو مجھے عارف میاں دیتے ہوتے بھلے لگتے۔ اور وہ کو رخصت کرتے رہے پرانہوں نے مجھے تو پوچھا ہی نہیں۔ میں نہیں لے جاتی؟“ اس نے یہ بات ہنسی میں کہی پر اس نے

ٹھیک کہا بیٹا اندر کا سارا کام اسی نے سنبھالے رکھا تم سب کو رخصت کر رہے تھے اسے بھی رخصت کرتے۔ ویسے تو وہ منستی ہنسنی پلی گئی ہے پر اسے بننے کی عادت ہے اور بیٹا، جن لوگوں کو بننے کی عادت ہوتی ہے نا۔ انسیں رونا بھی ہوتا ہے تو بننے لگتے ہیں۔ تب وہ ہنسنے ہیں تو اندر سے رو رہے ہوتے ہیں۔ تم نے ایک موچن سمجھ کر عالاں کی عزت نہ کی، حالانکہ عالاں کا اپنا مان ہے۔ اس کا یہ مان قائم رکھو بیٹا اور چاولوں کی یہ دیگچی اسے دے آؤ۔ تھوڑی دیر پسلے گئی ہے۔ سوتی نہیں ہو گئی۔ پھر کل صبح صبح تم جا بھی رہے ہو۔ وہ کیا یاد کرے گی تمہیں۔ جاؤ۔“

عالاں اپنے گھروندے کے دروازے کے پاس چارپائی پر لیٹی ہوتی تھی۔ میں نے پاس جا کر اسے آہستہ سے پکارا تو وہ ترطیب کر لیوں کھڑی ہو گئی جیسے اس کے قریب کوئی گولا پھٹا ہے۔

«عارف میاں جی!» دہ بولی۔ پھر حسب عادت ہنس کر کہا۔ «چاول دینے آئے ہوں گے۔»

میں نے کہا۔ «لاں۔ چاول ہی دینے آیا ہوں۔»
«لا یتے؟ اس نے ہاتھ بڑھائے۔ «بی بی جی نے بتایا ہو گا، میں نے کیا کہا تھا؟ دہ ہنسنے لگی۔

«باں۔ بتایا ہے؟ میں نے کہا۔
دیگچی کے کراس نے چارپائی پر رکھ دی اور بولی۔ «لاں۔ گھر میں دیتے تو زیادہ اچھا لگتا۔ ویسے اب بھی اچھا مگ رہا ہے۔»
کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ آخر ایک بات سو جھی۔ «میں کل صبح واپس جا رہا ہوں۔»

«وہ مجھے معلوم ہے؟ عالاں بولی۔

«معلوم تھا تو وہاں گھر میں ذرا سی رُک جاتیں ہے» میں نے کہا
 وہ بولی: «آپ کے کرتے کا آخری ٹانکا باقی تھا۔ وہ آکے لگایا ہے۔ بکے
 میں اس کرتے کی جگہ تو ہو گئی ناہ، اور ہاں صبح آپ کا بحاساً اٹھا کر بوس کے اڈے پر مجھے
 ہی تو آپ کو پہنچانا ہے۔ بی بی جی نے کہا تھا: «
 میں نے کہا۔ تم کیا کچھ کر سکتی ہو عالاں۔ چکنی تم پس سکتی ہو۔ — چھتیں تم لیپ
 سکتی ہو۔ مرچیں تم کوٹ سکتی ہو۔ کنوئیں سے دود دین تین گھنٹے تم پانی بھر لاتی ہو۔ پُلے
 گھر کا کام تم سن جا سکتی ہو۔ کرتے تم کاڑھ سکتی ہو۔ تم کس مٹی کی بنی ہوئی ہو عالاں؟»
 وہ خاموش کھڑی رہی۔ پھر دو قدم اٹھا کر میرے اتنے قریب آگئی کہ مجھے اپنی
 گردان پر اس کی سانسیں محسوس ہونے لگیں۔ میں تو اور بھی ہست کچھ کر سکتی ہوں عارف میاں!
 اس کی آواز میں جھنکار سی تھی: «آپ کو کیا معلوم میں اور کیا کچھ کر سکتی ہوں؟»
 ذرا سے وقفے کے بعد وہ بولی: «مجھ سے پوچھتے نا، میں اور کیا کچھ کر سکتی ہوں؟»
 پہلی جماعت کے پنجے کی طرح میں نے اس سے پوچھا: «اور کیا کچھ کر سکتی ہو؟»
 «میں پیار بھی کر سکتی ہوں عارف میاں!» اس نے جیسے کائنات کا راز فاش
 کر دیا۔

نیلا چھتر

اماں نے ہمیں آدمی رات ہی کو جگا دیا۔ ”انٹھو بیٹھو۔ منہ ہاتھ دھو لو۔ کپڑے بدل لو۔ شیر و مراثی اور نور اسار بان بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔“

اس وقت چاند سیدھا ہمارے سردن پر چک رہا تھا۔ ہوا اتنی خاموشی سے چل رہی تھی کبیری کے صرف ساتے میں کہیں کہیں جنمش ہوتی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اوپر پتھر ل رہے ہیں۔ پنځرے میں سوتا ہوا طوطا اپنے سر کو ایک طرف کئے پہن ہیں کچھ یوں چھپائے پڑا تھا جیسے کوئی اس کا سرکاٹ لے گیا ہے۔ بلی رو تی کا ایک گالا بنی بیٹھی تھی ”مازو با“ میں نے اسے بلایا تو وہ انٹھی۔ انٹھا اتنی لی تو وہ اپنے قد سے ڈیوڑھی لبی ہو گئی۔ پھر وہ دیہیں سے کو د کر میری چارپائی پر آبیٹھی اور خرخر کرتی ہوئی میری گود میں گھنے لگی۔

”تم نے بلی کی عادتیں بگھاڑ دی ہیں۔“ اماں جو ہمارے لئے چوری بنانے کی خاطر چولما جلا رہی تھیں، بولیں۔ ”اب تمارے جانے کے بعد یہ دو تین دن تک تو رو تی پھرے گی۔“

بھائی جان نے پوچھا۔ ”اور اماں۔ ہمارے چلنے جانے کے بعد آپ تو نہیں روئیں گی نا؟“

”دنیں تو“ اماں بولیں، اور پھر دنے لگیں۔

ہم چار پائیوں پر سے کوڈ کر آماں سے پٹ گئے اور آماں ہم دونوں کے سروں پر مانکھ پھیرتے ہوئے روتی رہیں اور کہتی رہیں ”میں کیوں ردؤں؟ میں زندگی بھر کیا کم روئی ہوں کہ اب بھی روؤں جب میرے نجی میرا سہارا بننے والے ہیں۔ پھر جب تم دونوں فوکر ہو جاؤ گے ناتومیں اپنی گزدی ہوتی زندگی سے جی بھر کر بدے دوں گی میں فواڑ کے پنگ پر سوؤں گی۔ میں رشیم کی چادر اور ڈھونوں گی اور تماری بیویوں سے اپنے پاؤں دبواؤں گی۔“

”ہماری بیویاں آج کل کہاں رہتی ہیں آماں؟“ میں نے پوچھا۔

اور بھائی جان ہنسنے لگے ”پاگل ہے یہ چھوکرا۔ شرم نہیں آتی۔“

آماں بھی ہنسنے لگیں اور مجھے سینے سے بھیخ کر بولیں ”وہ تمہارے چھاکی بالا خلنے کی مٹی پر ایک بڑا ستارہ چک رہا ہے نا۔ اس میں رہتی ہیں۔ یہ ستارہ تھوڑا تھوڑا مل رہا ہے۔ بتاؤ کیوں ہل رہا ہے۔“

میں بیری کے ساتے کی ہلکی ہلکی جنبش دیکھ رہا تھا، فوراً بولا۔ ”ہوا سے ہل ہے۔“ اور آماں ہنستی ہوتی بولیں ”نہیں بیٹا۔ ہوا سے کہاں ہل رہا ہے۔ ستارہ اس لئے ہلتا ہوا معلوم ہو رہا ہے کہ تمہاری بیویاں قہیں دیکھو دیکھ کر خوس ہو رہی ہیں اور تایاں بجا بجا کر ہنس رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ اس بڑھیا کے ٹھاٹھ دیکھو۔ ہم سے پاؤں دبوائے گی! یہ منہ اور مسروکی دال!“

”یہ کہہ رہی ہیں؟“ میں نے بھڑک کر کہا ”میں انہیں ماروں گا۔“

اچانک بتی چار پائی سے کوڈ کر پھر سے میری گود میں گھس آتی۔ آماں نے اس کی گردن کا چھڑا چکلی میں لے کر اسے اٹھایا اور اسے ایک طرف ڈال کر پائی سے اپنا پوٹا دھوتے ہوتے بولیں ”اس بے زبان کو تو پتہ چل گیا ہے کہ اٹھر گر میوں کی چھٹیاں

گزار کر واپس کیمبل پور جا رہا ہے۔“

ہم نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدالے۔ چوری کھائی اور نورے کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو آماں کے کہنے پر اسے بلا نہ نکلے۔

گاؤں بالکل چپ تھا جیسے سانش روکے پڑا ہے۔ جیسے کتنے تک مر گئے تھے۔
”بھائی جان!“ مجھ پر سنائے کا ہول مسلط ہونے لگا۔ چلنے والیں چلیں۔ خود آماں کہتی ہیں کہ
آدھی رات کے بعد گلیوں میں چن گھومتے ہیں۔“

بھائی جان بولے۔ ”آماں یہ بھی تو کہتی ہیں کہ آیتہ الکرسی پڑھنے سے چن بجاگ جاتے
ہیں۔ آیتہ الکرسی پڑھو۔“

میں نے سوچا اگر ایسی بات ہے تو خود بھائی جان آیتہ الکرسی پڑھتے ہوتے آگے
کیوں نہیں بڑھتے جبکہ نورے کا گھر کل دو گلیاں دور ہے۔ مگر میرے پاس زیادہ سوچنے
کا وقت نہیں تھا۔ میں آیتہ الکرسی پڑھنے لگا۔

ابھی میں ”ولاناوم“ سمجھ ہی پہنچا تھا کہ گلی کے پرے سرے پر ایک چن نمودار
ہوا۔ ”بھائی جان!“ میں نے چینخ کی حد تک سرگوشی کی اور بھائی جان سے پست گیا۔
”آیتہ الکرسی پڑھو۔“ انہوں نے بھی چینخ کی حد تک سرگوشی کی اور اپنے آپ کو میری
گرفت سے آزاد کیا۔ آماں کہتی ہیں کہ چن سے ڈر کر بھاگنے سے آدمی مر جاتا ہے۔ پھر
جن ان بچوں کو تو کچھ نہیں کہتے جو آیتہ الکرسی پڑھتے ہیں۔“

گلی کے پھرڑاک اور بچ رہے تھے اور اب جن ہم سے کوئی دس گز دور رہ
گیا تھا۔ پھر وہ وہیں رُک گیا اور بولا۔ ”کون ہوتا ہے؟ جن ہو؟ بجھوت ہو؟ کون ہے؟ بولو درد نہ پھر
مارتا ہوں۔“ اور اس نے جھک کر ایک پھر اٹھا بھی لیا۔

بھائی جان فوراً بولے مگر عجیب طرح بولے۔ میں ان کی آواز پہچان ہی نہ سکتا۔ ”ہم
اکبر اور اطہر ہیں۔“

”اوے بیڑا تر جائے تمہارا، وہ پتھر میں پر چینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔“ میں تو ڈر گیا تھا تم تو میرے سامنے ہو۔ میرا قو دل میرے چار طرف دھڑکنے لگا تھا۔ میں بھی کہوں یہ کون ہاتھ ماٹھ بھر کی چیزیں کھڑی ہیں ۔۔۔ اور پھر وہ ہنسا۔

”تم کون ہو؟“ اب کے بھائی جان باقاعدہ کڑکے۔

وہ بولا۔ ”میں تمہارا دھوپی ہوں۔ زمان دھوپی۔ کیا کر رہے ہو یہاں آدمی رات کو؟“ میں پہلی بار بولا یہ ہماری چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں۔ ہم کہبل پور جا رہے ہیں۔ ہم شیر و میراثی اور نورے سار بان کا انتظار کر رہے ہیں ۔۔۔“

”تم اس وقت کیا کرتے پھرتے ہو؟“ بھائی جان نے زمان سے یہ سوال ایسے رُعب سے پوچھا جیسے اُستاد پتوں سے پوچھتے ہیں۔

زمان بولا۔ ”میں پتھر کاٹنے جا رہا ہوں۔ روز اس وقت گھر سے نکلا ہوں۔ صبح کی نماز نیلی دھیری پر پڑھتا ہوں۔ پھر وہاں نیلا پتھر کاٹتا ہوں۔ تمہارے چھانیاں مکان بنوائیں گے نانیے پتھر کا۔“

”کیا دھوپی بھی پتھر کاٹتے ہیں؟“ بھائی جان نے حیران ہو کر پوچھا۔ اور زمان نے جواب دیا۔ ”جب دھوپی کے پاس دھونے کو کچھ نہ ہو تو اسے پتھر بی کاٹنے چاہیں۔ ورنہ وہ انسانوں کو کاٹنے لگے گا۔“ وہ ذرا سار کا منکر ہمیں خاموش پا کر ہنس دیا۔ پتھر بولا۔ کیا کروں۔ چھنپکے ہیں۔ نہ ان کی ماں ہے نہ دادی۔ سب مجھ میں گھسے چلے آتے ہیں بلی کے پتوں کی طرح۔ سب کا دوزخ بھزا ہوتا ہے اور خدا میرا سہارا ہے اور میں ان کا سہارا ہوں۔“

سہارا! میں نے سوچا۔ یہ سہارا کیا ہوتا ہے؟ ابھی ابھی آماں بھی کہہ رہی تھیں کہ تم میرا سہارا ہو۔ اب یہ زمان دھوپی بھی کہہ رہا ہے کہ خدا اس کا سہارا ہے اور وہ اپنے بال پتوں کا سہارا ہے۔ آخر کیا ہوتا ہے یہ سہارا ۔۔۔ کیوں بھائی جان؟ یہ

سہارا کیا ہوتا ہے؟“
مگر جائی جان نے تو میری بات سنی ہی نہیں۔ تالی بجادی: “آگیا نورا!“ انہوں
نے نفرہ مارا۔

”اب نیلی ڈھیری پر ملاقات ہو گی۔“ زمان دھوبی بولا۔ ”خوشاب کارستہ وہیں سے
گزتا ہے نا۔ میں تمیں ایک نیلا پتھر دوں گا جو میں نے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس میں
مگری نیلی لہریں ہیں اور نیلی نیلی چڑیاں سی اڑرہی ہیں اور نیلے نیلے پھول سے کھل رہے
ہیں۔ قدرت بھی عجیب عجیب سکھیں کھیلتی ہے۔ میں تو دو پر کوئی وہ پتھر دیکھتا ہوں تو
جی چاہتا ہے کہ نماز پڑھنے لگوں۔ لے جانا اپنے ساتھ۔ اپنے چاچا جی کو دینا۔ کتنا زمان
دھوبی نے بھیجا ہے۔ وہ خوش ہوں گے۔ خدا کے بعد ہم غریبوں کا وہی تو سہارا ہیں!“
”سہارا!“ میں باقاعدہ چونک پڑا۔ مگر زمان آگے بڑھ گیا تھا۔

دُور سے اونٹ کتنا بہت سالمباگ رہا تھا۔ اس کی گردن میں ٹکنی ٹکنی یہیں
نک رہی تھی جیسے کوئی لڑکی گاہری ہے۔ تب ایک مرغ نے بانگ دے ڈالی۔ پھر تو
بانگوں کا تانبا بندھ گیا۔ قادرے کے باڑے میں ایک بھری میانی اور فوراً بعد اس کا
کتا جھونکا۔ گاؤں نے انگڑائی سی لی جیسے ہمیں رخصت کرنے کے لئے اٹھا بلیٹھا ہے۔
میں اندر بھاگا۔ پھر شیر و دروازے پر سے پکارا۔ ”لبی جی، پرده۔“ میں اندر آگ کہ پچوں
کا صندوق اٹھا لوں۔“

”دو صندوق ہیں!“ میں نے شیر و کوڑا ڈالتا۔

”اہاہا!“ شیر و نے میری بغلوں میں ہاتھ رکھ کر مجھے پکڑا اور اپنے سر سے
بھی اوپر اچھا لے گیا۔ اب تو میرا چھوٹا سا میں بھی صندوق والا ہو گیا۔ تمہاری موچپیں کب
نکلیں گی۔ جلدی جلدی سے بڑے ہو جاؤ نا۔ پھر میں تمہاری شادی پر ایسا ایسا دھول
بجاوں گا کہ تان سین نے بھی ایسا دھول نہ بجا یا ہو گا۔ تمی تو مجھے غریب کا سہارا ہو۔“

پھر وہی سہارے کیا ہوتے ہیں آخر میں اس سے پوچھنے لگا تھا کہ
اس نے صندوق اٹھا کر کندھے پر رکھا اور باہر چلا گیا۔ اندر کوٹھے میں امی ہمیں پیٹلت
کھڑی رہیں اور کچھ پڑھتی رہیں اور ہم پر چھوہ چھوہ کرتی رہیں اور روتنی رہیں۔ پھر شیر و
دوسرے صندوق بھی لے گیا اور جاتے ہوئے کہا گیا ”چلو جی“

جب ہم کجاوے میں بیٹھے تو جب بھی ڈیور ٹھی کے رد دازے کے پیچھے سے
امی کی روتنی آواز آرہی تھی ”اللہ انہیں خیر خیریت سے پہنچانا۔ اللہ انہیں کوئی
گزند نہ پہنچے۔ اللہ تیرے بعد یہی تو میرے سہارے ہیں۔“

سہارے! — میں بھائی جان سے ضرور پوچھتا مگر ہم دونوں کے درمیان اُنٹ
کا کوہاں حائل تھا، اور پھر مجھے ایک دم بہت سارونا بھی تو آگیا تھا۔ اونٹ لگی کاموڑ مڑا
تو میں ضبط نہ کر سکا۔ میں نے ہجن ماری ”امی جی!“ — اور بھائی جان کجاوے میں
گھٹنوں کے بل اُٹھے اور مجھے ڈانٹا۔ ”دیکھتے نہیں ہو ساتھ شیر و اور نورا آرہے ہیں۔ وہ
کیا کہیں گے کہ ہم اتنے بزدل ہیں۔ پوچھ لو آنکھیں۔ چپ ہو جاؤ۔ آیت الکرسی پڑھو“
مجھے بھائی جان کی آواز بھی جیکی جیکی لگی۔ میں نے کہا ”آپ بھی آنکھیں پوچھ لیں اور
آیت الکرسی پڑھیں۔“

اور وہ جیسے مان گئے ”اچھا!“

پھر میں نے کجاوے میں گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر کہا ”بھائی جان۔ جب زمان
دھوپی اپنے بچوں کو گھر میں چھوڑ کر نیلی ڈھیری پر جاتا ہو گا تو ہماری طرح رہتا ہو گا۔
”کیوں؟ وہ کیوں روتے؟“ بھائی جان نے پوچھا۔

میں نے کہا ”ہم اپنی امی کے سہارے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کا سہارا ہے۔

ہم رُد رہے ہیں تو وہ کیوں نہیں روتا؟“ میں سہارے کو فقرے میں استعمال کر کے
بہت خوش ہو رہا تھا۔

”چپ رہو۔“ بھائی جان بولے۔ ”یقین آئیہ انگریزی پڑھ رہے ہو؟“
گاؤں سے باہر جب اونٹ کھیتوں کی ایک پکڈنڈی پہلنے لگا تو نور نے
اسے روک لیا۔ پھر شیرود نے کجاوے کے قریب آکر کہا۔ ”لوگی اب میں داپس چلوں۔
پتے جائیں تو مجھے کھات پر نہ پاکر رہتیں گے۔“

”تم اپنے بچوں کے سہارے ہونا چاچا شیرود؟“ میں نے سہارے کا ایک اور
نقرہ گھٹرا، اور شیرود نے نورے سے کہا۔ ”دیکھنا نورے۔ کسی چٹاک پٹاک باتیں کرنے
لگا ہے میرا چھوٹا سایں۔“ پھر اس نے اپنا ہاتھ اور پر کجاوے کی طرف بڑھایا۔ میں نے
کجاوے میں سے اپنا ہاتھ لٹکا کر مصروف نگی کیا تو وہ میرے ہاتھ کو ہولے ہولے ہلاہلا کر
کہنے لگا۔ وعدہ کرو جی کہ اس ایک سال میں تم ایک دم دس سال بڑے ہو جاؤ گے۔
کہیں میں تماری جوانی کی راہ تکتے تکتے کھسک ہی نہ جاؤں اور کہیں یہ حسرت دل
ہی میں نے جاؤں کہ میاں اکبر اور میاں اطہر کی شادی پر میں دوسرو پے کماوں گا
اور اپنی ماں کے دانت مگواوں گا۔ لکھ لوکسی کتاب میں۔ دوسوے کم ایک پیسہ نہیں
لوں گا۔ تم کم دو گے تو روٹھ جاؤں گا۔ میری ماں بیچاری تو اسی سہارے اپنے پوپلے
منہ سے پٹاٹے چھوڑتی رہتی ہے۔“

شیرود اور نورا منہے۔ پھر شیرود نے دوسرے کجاوے میں بھائی جان سے
ہاتھ ملایا۔ اس نے بھائی جان سے بھی کچھ ایسی باتیں کی ہوں گی مگر میں نے سنی نہیں۔
اب اونٹ پہلنے لگا تھا اور میں اونٹ کی گھنٹی کی ایک ہی رٹ سن رہا تھا۔ رہ کہہ
رہی تھی۔ — سہارے ہی سہارے۔ سہارے ہی سہارے۔ سہارے ہی سہارے۔
پھر لیکا یک یوں ہوا جیسے کسی نے چار طرف آسان کے کنارے کے ساتھ چورتی
گھنادی ہے۔ آس پاس کی جھاڑیوں پر کہیں سے اتنی بہت سی چڑیاں آگئیں کہ اونٹ
کی گھنٹی کی رٹ دب گئی۔

”یہ تو آپس میں مژہ ہی ہیں۔“ میں نے بھائی جان سے کہا۔
 اور اونٹ کی ہمار تھام کر ہمارے آگے آگے چلتا ہوا نورا ہنس کر بولا۔ ”میں
 میاں۔ لڑکاں رہی ہیں۔ دن بھر پیس چین کرنی ہے۔ اس لئے گلے صاف کر رہی ہیں۔“
 اس پر بھائی جان یوں ہنسے جیسے پچھے فرش پر بلو رکے بہت سے لعل گر پڑیں۔
 پھر وہ بولے۔ ”چاچا نورے۔“

نورا پڑھے بغیر بولا۔ ”جی میاں۔“
 بھائی جان نے کہا۔ ”کوئی کہانی سنا۔ جیسے پچھلے سال سنائی تھی۔“
 نورے نے پوچھا۔ ”وہی گیدڑ والی جو تھے توے پر بیٹھ گیا تھا اور جب گھبرا کر
 بھاگا تھا تو اس کے ساتھ تو با بھی چڑا چلا گیا تھا۔“

ہم دونوں نے جیسے پوری کہانی سن لی! ہنسنے ہنسنے بے حال ہو گئے۔
 ”چلو وہی سناؤ۔“ میں نے کہا۔ ”بھائی جان کو یاد ہو گی۔ مجھے تو یاد نہیں۔“
 ”مجھے تو یاد ہے۔“ بھائی جان بولے۔ ”پرمزیدار ہے۔ پھر سن لیں گے۔“
 ”تو ہو سنو،“ نورا بولا۔ ”ایک تھا گیدڑ۔ چورا چکا قائم کا گیدڑ۔ ایک غریب بڑھیا
 کے توے پر سے روٹیاں اٹھا کر بھاگ جاتا تھا۔ ایک دن —“

اچانک بھائی جان بولے۔ ”ہم نیلی ڈھیری پر کس وقت پہنچیں گے چاچا نورے؟“
 ”نیلی ڈھیری پر،“ نورے نے جیسے سوچا۔ ”جب سورج پورا طباق سا نکل
 آتے گانا، اس وقت ہم نیلی ڈھیری پر ہوں گے۔“

”اس وقت تک زمان دھوپی کتنا نیلا پتھر کاٹ چکا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ارے!“ نورے نے چلتے چلتے پہلی بار پڑ کر دیکھا۔ ”میاں تمہیں کس
 نے بنایا کہ زمان پتھر کا طما تھے؟“
 بھائی جان بولے۔ ”ہم تمہاری راہ دیکھ رہے تھے تو گلی میں سے گزر اتھا کہتا

تھا میں تمیں نیلی ڈھیری پر ملوں گا۔“

”اچھا!“ نورا مطمئن ہو گیا۔ پھر بولا۔ ”یہ لوگ جاتے ہی تو پتھر نہیں کاٹنے لگتے۔ اگر کمل کا پتھر کھا ہو گا تو اسے کامیں گے۔ ورنہ صبح سوریے بارود بھریں گے۔ پھر باڑو کو فلیٹہ لگائیں گے۔ زور کا ایک گولہ چھوٹے گا۔ چنانیں خربوزوں کی طرح چھارڈی چھاڑی ہو جائیں گی۔ تب زمان اور دوسرے مزدود زمان کو جمع کر کے انہیں ہاتھ مانند بھر کے پتھر دل میں کامیں گے۔“

”ارے، اتنی محنت کرنی پڑتی ہے؟“ بھائی جان بولے۔

”ہاں جی!“ نورے نے تائید کی۔ ”خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ ڈیوں کے اندر کا گودا خشک کرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر بال بچوں کے لئے ایک روٹی کمائی جاتی ہے؟“

بھائی جان کو صدمہ سا پہنچا۔ بولے۔ ”تو پھر ہمارے چھاپ جان انیٹوں کا مکان کیوں نہیں ہوا لیتے؟“

”ارے نہیں میاں!“ نورا ہنسا۔ ”نیلے پتھر کے مکان کی تو شان ہی اور ہے۔ اکبر بادشاہ نیلے پتھر ہی کے محل میں رہتا تھا۔ نیلے پتھر کو بس دوہارا سمجھو۔ مستری جب انہیں سنوارتے اور برابر کرتے ہیں تو ایک ایک پتھر ایک ایک دن لیتا ہے۔“

”اچھا!“ — ”ہاں جی!“

سُورج کا انتہا مشرق میں چمکا تو نیلی ڈھیری کی طرف ایک دم پڑے زور کا دھماکہ ہوا اور اس پاس کی پماڑیاں دیر تک بختی رہیں۔ ”یہ نومیاں!“ نورا بولا۔ ”بارود سے چان چھارڈی۔ اب جب ہم نیلی ڈھیری پر ہنپیں گے تو زمان اور دوسرے لوگ پتھر کاٹ رہے ہوں گے۔“ ہم نیلی ڈھیری پر پہنچے تو دو آدمی بھاگتے ہوتے ہمارے پاس سے گزرے۔ نورے نے اسیں ٹوکا دیکیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟“

”خیر کہاں بھائی؟“ ان میں سے ایک بولا۔ ”کسی سے غلطی ہو گئی۔ ابھی لوگ ٹھیک طریقے پھٹپنے بھی نہ پاتے تھے کہ دھماکہ ہو گیا اور چنان کے ٹکڑوں نے مزدوروں کو ادھیر کر پھینک دیا۔ کتنے ہی لوگ لمولہاں ہو رہے ہیں۔ ہم گاؤں سے آدمی لینے جا رہے ہیں انہیں انھوا کر قبیلے کے ہسپتال میں پہنچانے کے لئے؟“

”زمان تو ٹھیک ہے نا،“ میں کجاوے میں گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر پکارا۔

”زمان؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”ہاں ہاں بھتی۔ اپنا زمان دھوپی؟“ نورا بولا۔

”اچھا ہاں۔ وہ دھوپی!“ وہ شخص بولا۔ ”نیدے پھر کی کرچوں سے اس بے چارے کی تو آنکھوں کی پتیاں ہی لٹٹ گئی ہیں۔ کامیابی کی سی تو ہوتی ہے آدمی کی آنکھ۔“ بھائی جان جیسے فریاد کرتے ہوتے بولے۔ ”مگر زمان تو کتنا تھا، خُدا اس کا سہارا ہے اور وہ اپنے بچوں کا سہارا ہے!“

وہ شخص جلدی میں تھا۔ جاتے ہوئے بولا۔ ”اس بے چارے نے تو بس ایک ہی رٹ لگھا کھی ہے۔ میرے بچوں کا کیا بنے گا۔ میرے بچوں کا کیا بنے گا؟“ کیا بنے گا؟ کیا بنے گا؟ کیا بنے گا؟ — اونٹ کی گردان میں بھتی ہوتی گھنٹی کے اس سوال نے پوری نیلی ڈھیری کو اپنے محاصرے میں لے لیا تھا اور اس پاس کی ڈھیریاں اس گونج کی جھولیاں بھر کر جیسے اُد پر آسمان کی طرف اچھال رہی تھیں۔

بارہ مر

رخشی نے سگریٹ کا کش لگا کر سرتیج پھیپھی کا اور دھوئیں کو ایک مینار کی صورت میں چھت کی طرف اڑاتے ہوئے بولی : "ایک بات کہوں مودی ؟ پر ایک شرط ہے۔ تم خفائنیں ہو گے ؟"

محمود کا یہ پانچواں پیگ تھا۔ پانچویں پیگ کے ساتھ ہی وہ بظاہر اپنے وجود میں سے نکل بھاگتا تھا اور اس کا ثبوت یوں دیتا تھا کہ گفتگو کے دوران میں ایک آدھ جملہ ترجم میں ادا کرتا تھا۔ وہ بولا : "بول رخشی ڈارلنگ !" پھر وہ ٹنگنا یا "بول کیا بولتی ہے ؟" رخشی نے ایک اور کش لگایا اور دھوئیں کو دھارے کی صورت میں سیدھا محمود کے سمجھنے میں چھپوڑ دیا۔ محمود زور سے ہنسا اور بولا : "ویکھو ڈارلنگ ، کیمیں تمہارے سگریٹ بجھ تو نہیں گیا ہے۔ اس کا دھواں تو بہت ٹھنڈا ہے، جیسے تمہارے گرم گرم پھیپھڑوں کے بھائی کلب کے ایتر کند ٹلیشز میں سے نکلا ہے ؟"

رخشی ہنسی اور کلب میں بیٹھے ہوئے سب خواتین و حضرات نے ایک ساتھ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

دراصل رخشی بہت محہنسی تھی مگر جب وہ ہنستی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بہت سی کوئیں ایک ساتھ بولنے لگی ہیں۔ عورتیں اس کی ہنسی کی نقل کرتی

تھیں۔ مرد جب سرور میں آتے تھے تو اس سے ذرا سا ہنسنے کی لیوں فرمائش کرتے تھے جیسے وہ ہنسنی نہیں ہے، غزل گاتی ہے۔ رخشی کو اپنی ہنسی کی قیمت کا احساس تھا۔ چنانچہ وہ اسے بہت کم خرچ کرتی تھی۔ وہ ہنسنے کے معاملے میں بہت تدریسے کام لیتی تھی۔ جب ساری محفل قیمتوں کے لگا رہی ہوتی تھی تو وہ صرف مسکرانے پر اکتفا کرتی تھی۔ وہ اپنی ہنسی کو اس ہجوم میں گنوانا نہیں چاہتی تھی، اس لئے جب وہ ہنسنی تھی تو صرف وہی ہنسنی تھی۔

رخشی کی ہنسی نے جیسے جال پھینک کر پورے کلب کی مچھلیاں سمیٹ لیں۔ «بھائی چدھے ہے!» رخشی کی ہنسی پر نگینہ تک چونک ڈری نگینہ اور اس کا شوہر مختار آج پام گرد و کلب میں اپنے دوستوں کے مہمان تھے اور نگینہ ان میں گھری ہوئی کہہ رہی تھی: «اگر میری ہنسی اتنی سُریلی ہوتی تو پتہ ہے میں کیا کرتی؟ میں ہنسنے ہنسنے مر جاتی؟»

اس پر مختار کے دوستوں نے نگینہ کو ڈری تشویش سے دیکھا اور مختار بولا۔

«تم اگر ہنسنے ہنسنے مر جاتیں، تو پتہ ہے میں کیا کرتا ہو میں رو تے رو تے مر جاتا۔»

«تو کیا آج کل تم اپنے آپ کو زندوں میں شمار کرتے ہو؟» نگینہ نے پوچھا اور

سب مردوں نے ہنسنے ہنسنے میز پر ہاتھ بلکہ سر دے مارے۔

«یہ لوگ کیوں ہنس رہے ہیں؟» رخشی نے محمود سے پوچھا۔

محمود بولا۔ «اس وقت نگینہ کے گرد مختار سمیت چار پانچ مرد جمع ہیں اور جب ایک خوبصورت عورت کے پاس اس کے شوہر کے علاوہ ایک سے زیادہ مرد جمع ہوں تو وہ ایک دوسرے کے ڈر کے مارے۔ اور اب محمود لگانے لگا۔ «ایک دوسرے کے ڈر کے مارے باتیں کم کرتے ہیں اور ہنسنے زیادہ ہیں۔» رخشی اس بات پر تماں بجا کر اتنی ہنسی کر دہ دوہری ہو گئی۔

اور سارا لکب حیران رہ گیا کہ رخشی نے دو ہی منٹ بعد دوبارہ ہنسنے کی عیاشی کیسے کر لی۔

مگر رخشی آج اسرات پر مجھور تھی۔ اسے آج محمود سے ایک کام تھا۔ ”تو پھر کہوں مودی؟“ اس نے پوچھا۔

محمود نے ترجمہ میں جواب دیا۔ ”کہو نہیں ڈارنگ۔ حکم دو۔ آرڈیننس جاری کرو۔“ رخشی بڑی آسودگی سے مسکراتی اور میز پر دونوں کہنیاں لیکر کر بولی۔ ”آج کل مختار مجھے بہت پریشان کر رہا ہے۔“

محمود نے ایک دم پیگ اپنے ہونٹوں سے ہٹایا اور پرلی طرف بیٹھے ہوئے مختار کی طرف گھوڑے نے لگا۔ پھر وہ سکی کی بوتل کو گردن سے پکڑ کر بولا۔ ”کہو تو جا کر یہ بوتل اس کے سر پر توڑ دوں۔“

”نہیں یہ بات نہیں ہے مودی۔“ رخشی کے ہجے میں پوچھا رہی تھی۔ ”تم سنو تو مگر پہنچ دعہ۔ خفا تو نہیں ہو گے نا۔“

”یہ خفا خفا کی کیا رٹ لگا رکھی ہے رخشی؟“ محمود خفا ہونے لگا۔ ”تم سے خفا ہو کر کیا مجھے اپنا ہارٹ فیل کرنا ہے؟ بولو۔ جلدی سے بولو۔“

رخشی نے اپنی لمبی سڈول گردن آگے بڑھائی۔ سنوکل مختار نے مجھے زبردستی کرنے کی کوشش کی۔

محمود کا ہاتھ بوتل کی گردن کی طرف بڑھا۔ مگر رخشی نے اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس پر اپنا دوسرا ہاتھ پھیرنے لگی۔ ”تم سنتے تو ہو نہیں۔ میں چاہتی ہوں ذرا دیکھیں مختار کتنے پانی میں ہے۔“ پھر اس نے سرگوشی کی۔ ”میں کل دو چار گھنٹے اس کے ساتھ شاہ بلوط ہوٹل میں گزارنا چاہتی ہوں۔ میں صرف ٹوہ لگانا چاہتی ہوں کہ نیگینہ سے شادی کرنے کے بعد بھی وہ۔۔۔“

”ہاں ہاں!“ محمود کو بھی کرید ہوئی۔ ”اگر مختار نگینہ کی سی شہزادی سے شادی کر کے بھی۔۔۔“

”شہزادی؟“ رخشی نے بھڑک کر محمود کی بات کاٹی۔ ”شہزادی کیسے؟“
محمود ہنسا۔ ”اری نہیں ڈار لگ اس بے شہزادی کہتے ہیں نا۔ دراصل اس کی چال ڈھال میں جو دبدبہ ہے، اس کے ناک نقشے میں جو وقار ہے وہ صرف شہزادیوں میں ہوتا ہو گا۔ اگر مختار اس شہزادی لڑکی سے شادی کر کے بھی تمہیں پریشان کرتا ہے تو وہ تمہارے حسن کو اس سے بڑا خراج اور کیا ادا کرے گا۔ میں نہیں کتنی بار بتایا ہے کہ نگینہ بہت خوبصورت ہے، بہت ہی خوبصورت ہے، بہت بہت ہی خوبصورت سی مگر جب وہ میری رخشی کے سامنے آتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے۔۔۔ جیسے۔۔۔“

محمود اپنا ماتھا دبانے لگا۔ پھر بولا۔۔۔ ”جیسے وہ سکی کے پیگ کے سامنے چاتے کی پیالی رکھی ہو۔۔۔“

”رخشی مسکراتی تو محمود بولا۔۔۔“ ”جیسے کبوتری کے سامنے چڑیا بیٹھی ہو۔۔۔“
رخشی نے اب کے ہنسی پر بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ اور محمود بولا: ”جیسے بیٹگے کے کوئے شے میں اینکسی کھڑی ہو۔۔۔“

اب کے رخشی ہنسی پر ضبط نہ کر سکی اور نیجتھا پورے کلب کی گزیں اس میز کی طرف مر گئیں جہاں رخشی اور محمود نے جیسے درآٹی شو شروع کر رکھا تھا۔

”سریر!“ رخشی نے ہاتھ بڑھا کر محمود کے گال کی یوں چکلی لی جیسے اس کے سامنے دو چار برس کا بچہ بیٹھا ہے۔ پھر دہ تناک کر دوئی۔ ”شیو کب بنایا تھا؟ کئی بار کہا ہے کہ دوبار شیو بنایا کرو۔ ایک صبح کو ایک شام کو۔۔۔ لے کے میری بے چاری انگلیوں کی پوریں چھپیں دیں!“

محمود اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی پوروں کو چومنے لگا۔ پھر اس کے دلوں ہاتھوں
میں اپنا چہرہ رکھ کر بولا: ”اب کہو؟“

رخشی نے اس کے گاوں پر تھیلیاں ملتے ہوئے کہا: ”بس میں صرف یہ دیکھنا
چاہتی ہوں کہ مختار شادی کے ایک ڈیڑھ مینے بعد ہی نگینہ سے کیوں بدک اٹھا ہے؟“
 ”تم نے سائیکلو جی کا ایم اے تو کر لیا ڈارنگ!“ محمود بولا: ”اب کیا مختار کی
سائیکلو جی پر تھیس لکھنا ہے؟“

رخشی کو سہارا ملا۔ ”بس عادت سی ہو گئی ہے ہر شخص کے اندر گھس جانے
کی۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں اس کے اندر کیا ہے۔ یاد ہے شادی سے پہلے، جب
نگینہ کے ڈیڑھی، ڈرنک پارٹی سے فارغ ہو کر نگینہ کو ساختے جانے کے لئے لان
میں گئے تھے تو مختار کا ساچھا طفا، سُرخ و سفید، چوڑا چکلا، اپالو کا سا ہمینہ سم جوان،
نگینہ کے قدموں پر سر رکھے پڑا تھا اور جب نگینہ کے ڈیڑھی نے اسے اٹھنے کو کہا
تھا تو پتہ ہے اس نے کیا جواب دیا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ نہیں انکل ابھی نہیں۔ ابھی نیڑا
سجدہ مکمل نہیں ہتا۔ یاد ہے وہ اپنے شاہ بلوط کلب کی لکشمی اور جیں کی سی لڑکیوں
کو چھوڑ کر اس پام گروہ کلب میں چوروں کی طرح آتا تھا اور مجبوں کی طرح اپنی میلائی کیتے
سب کے سامنے باقاعدہ آنسوؤں سے روتا تھا۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ آخر۔۔۔“
 ”ہاں ہاں، کیا فرق پڑتا ہے ڈارنگ؟“ محمود نے چھٹے پیگ کے باقی نصف
کو غٹ غٹ چڑھا کر کہا۔

اپانک اس کے تیور بجڑا گئے اور وہ خاصے جذبے سے بولا۔ ”مگر یاد رکھو
اگر بات اس سے آگے بڑھی تو میں مختار کو مار داؤں گا۔ وہ میرا دوست ہے مگر دوست
ہی دوستوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں۔ قابل نے تو اپنے بھائی ہابیل کو مار ڈالا تھا!
 ”لایں مودی ڈیرا!“ رخشی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تم اور ایسی جانوروں کی سی بات!“

پھر اُس نے جھک کر محمود کی ٹھوڑی کو انگوٹھے اور انگشت شہادت سے پکڑا
اور پچھے کی طرح تلاکر بولی۔ "اچھے اچھے، منے منے، پیا لے پیا لے پچھے ایسی
بایقں نہیں کلتے!"

محمود نے رخشی کا دہنی ہاتھ پکڑ کر اس زور سے چو ماکہ چٹا خ کی اس آواز سے
پورا کلب ایک بار پھر متوجہ ہو گیا۔

"تو پھر کل میں یہاں نہیں آ رہی ہوں۔" رخشی بولی۔

"صرف کل۔" محمود نے فیصلہ سنایا۔

"ہاں ہاں صرف کل۔" رخشی نے اتفاق کیا۔

"میری قسم کھاؤ۔" محمود نے مُطابِبہ کیا۔

"تمہاری قسم۔" رخشی فوراً بولی۔

"تو پھر ڈھیک ہے رخشی ڈار ڈنگ۔" محمود بولا۔ "بس یہی ہو گانا کہ کل میں آدھی
کی بجائے پوری بوقت پی لوں گا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" پھر وہ گانے لگا اور ساتھ
ساتھ چلکی بھلانے لگا۔ "کیا فرق پڑتا ہے جی کیا فرق پڑتا ہے!"

رخشی نے محمود سے صرف ایک رات کی چھٹی لی تھی مگر وہ دوسری رات بھی
نہ آئی۔ محمود نے پہلے ایک پیگ پیا مگر پھر پوری بوقت منگالی اور اس بوقت کو سامنے
رکھے وہ رخشی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا اور کلب کے دوسرے
ممبر اسے کنکھیوں سے دیکھتے اور محظوظ ہوتے رہے۔ پورے کلب سے رخشی
کو چین کر محمود نے کچھ ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ بھرے ہوتے ہاں اور بار کے کا دن
پر جمع، سجوم اور ساتھ کے کمروں اور بیلرڈ رومن سے کوئی بھی اس سے یہ پوچھنے نہ آیا
کہ آج وہ ڈوبا ہوا کیوں ہے، طلوع کیوں نہیں ہو رہا ہے، وجہ بھی کو معلوم تھی۔ کلب

میں رخشی کا نہ آنا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ سمجھتے سب تھے مگر سب خاموش تھے اور اس خاموشی سے ہر اس بھی تھے جیسے کوئی طوفان ٹوٹنے والا ہے۔

یہ حیرت اور ہر اس بس پہلی رات تک تھے۔ وہ حیران ہوتے رہے کہ محمود نے بیرے کو بلا کر بوقت کھلوانی اور پیگ پر پیگ چڑھانے لگا۔ اور ہر اس بانے کے کوئی گلاس میز پر رکھتا نہیں تھا۔

ختم ہونے والی تھی اور اب محمود نیا پیگ بنانے کے لئے گلاس میز پر رکھتا نہیں تھا۔

بلکہ دے مارتا تھا۔ ابھی وہ اٹھنے کا اور جو پہلا شخص اس کے سامنے آئے گا اسے گریبان سے پکڑ کر اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دے گا۔ شرایبوں کے آؤٹ ہونے کے اپنے اپنے اسلوب ہوتے ہیں۔ کوئی ایک دم چپ ہو جاتا ہے۔ کوئی دنیا کی بے شباتی پر زار زار رونے لگتا ہے۔ کوئی اپنے پاس نیٹھے ہوتے شخص کے قدموں پر یہ کستہ ہوتے گر جاتا ہے کہ وہ کتنا بے مثال آدمی ہے اور کوئی چیزیں توڑنے اور کھوڑیاں پھوڑنے میں لگ جاتا ہے۔ محمود آؤٹ ہونے کے بعد یہی چیزوں کی بات تھا۔

پہلی رات تو اس نے عالیہ تک کوئی لفڑ نہ دی جو رخشی سے پہلے محمود کی بلانا غدہ کی ساختی تھی۔ آج میدان خالی دیکھ کر وہ اس کی طرف یوں والہا نہ انداز سے بڑھی جیسے اس کا بابس کیس پیچھے رہ جائے گا اور وہ آگے بڑھ جاتے گی۔ آج تو وہ یوں سچ سجا کر آئی تھی کہ اپنے آپ سے بھی نسلکی پڑ رہی تھی۔ وہ آئی اور محمود کے اتنے قریب جا کھڑی ہوئی کہ کسی اور کے اتنا قریب جاتی تو وہ اس کے نیچے پیٹ پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا۔ مگر محمود نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، اٹھا اور بار کے کاونٹر کی طرف ٹھیل گیا۔ پھر جب عالیہ نہایت غصے میں ملٹی تو وہ مسکرا تاہو اپنی سیٹ پر آبیٹھا۔

کلب میں سب کی نظریں ادھر رخشی کے انتظار میں اندر باہر کھلنے والے نیم دروازے پر اور ادھر محمود کے غیر منطقی اطمینان کی وجہ سے محمود پر لگی تھیں۔ بس اتنا ہوا کہ اس رات جب محمود اٹھا تو خط مستقیم میں چلنا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا اور نہ دُ

کسی سے اُلٹجا نہیں۔ جب وہ چلا گیا تو ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں نے کورس میں گانا مشروع کر دیا تھا یہ کوئی فرق نہیں پڑتا جی کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ پھر جب وہ چینچ چینچ کر قسمتے لگا رہے تھے تو یہم دروازے پرے محمود کامنودار ہوا۔ پُرے کلب پر جیسے نائٹ کی جھاڑ دپھر گئی اور محمود جیسے مطمئن ہو کر واپس چلا گیا۔ جب رخشی دوسرا رات بھی نہ آئی تو سب کو تشویش لاحق ہوئی مگر جب محمود کو اپنے سامنے دہسکی کی بوتل رکھے، بت بنے بیٹھا دیکھا تو آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ لوچ چور دل پر مور پڑ گئے۔

اور یہ اسی دوسرا رات کا واقعہ ہے کہ جب بہت دیر ہو گئی تو محمود کے بت میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ انھا۔ اس نے بوتل کو گردن سے پکڑ کر فرش پر دے مارا اور سب لوگ یوں چونک پڑے جیسے کلب میں ہم پھٹ گیا ہے۔ محمود دنوں ہاتھ کمر پر رکھے یوں کھڑا تھا جیسے اس نے بوتل نہیں توڑی، مختار کو قتل کر دیا ہے اور فرش پر شراب نہیں بہر رہی ہے، رخشی، مختار کے چنگل سے نکل کر اس کی طرف پکی آرہی ہے۔ “ یہ بوتل میری تھی ۔ ” اس نے آس پاس جمع ہوتے ہوئے کلب کے اہلکاروں کو ڈالنا۔ یہ میری مرضی ہے کہ میں اسے پیوں یا توڑ دوں یا کسی کے سر پر دے ماروں । ” سب چپ چاپ ملپٹ گئے اور محمود اندر باہر کھلنے والے دروازے میں سے اس تیزی سے نکلا کہ دروازہ دیر تک اندر باہر کھلتا رہا۔

اور یہ بھی اسی رات کا ذکر ہے۔ رخشی شام سے مختار کے پیچے پڑی ہوئی تھی کہ وہ محمود کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا چاہتی ہے، مگر مختار نہیں مانتا تھا یہ وہ مجھے یا تمیں مارڈا لے گا رخشی ڈیر۔“ وہ کہتا رہا۔“ وہ میرا پُرانا یار ہے۔ میں اسے پوری طرح جانتا ہوں۔ شکست کھانا تو اسے آتا ہی نہیں۔ اسی لئے تو وہ اب کے ایکیش میں بھی

کھڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ طریقے باتیں کرنے لگے ہیں اس لئے وہ ہار جاتے گا اور وہ ہارنے کی بجائے مارنا یا مرجانا بہتر سمجھتا ہے۔ اس نے مجھے بھی ایکشن رٹن سے روکا تھا، مگر میں رٹا اور ہار گیا۔ اس کی سیاسی بصیرت بہت تیز ہے۔ اس کی سمجھی بصیرت میں بہت تیز ہیں اور اپنی انہی بصیرتوں کو کند رکھنے کے لئے تو انہی بہت سی پیتا ہے۔ دراصل وہ اپنے آپ سے ڈرتا ہے کہ وہ ہوش میں رہے گا تو نہ جانے کیا کر سمجھے گا۔ سو ڈنیز، اسے آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے حالات میں آدمی کو آگاہی خود بخود ہو جاتی ہے۔ تم محمود کے پہلو میں تھیں، مگر مجھے آگاہی حاصل ہوئی کہ اندر سے تم میری ہو۔ محمود کو بھی معلوم ہو جاتے گا کہ اندر سے تم اس کی نہیں تھیں۔ تب وہ کوئی نہ کوئی خطرناک حرکت ضرور کرے گا اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں کلاچی چھوڑ کر لاہوڑ چلے جانا چاہیتے۔“

«مگر تارے پیارے! رخشی نے کہا: "اس نے مجھ سے عشق کیا ہے۔ وہ میرے بغیر پاگل ہو جائے گا۔ میں اسے ایسی موت مرتا نہیں دیکھ سکتی کہ ایک لکھ پتی کو گلیوں کے پچھے پتھر مارتے پھریں۔ اگر تم مجھے نہ ملتے تو دنیا کا کوئی بھی مرد مجھے خسود سے نہیں چھین سکتا تھا۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ میرے بغیر کیسا ہے۔ میں چاہتی ہوں اسے معلوم ہو جائے کہ اب اسے میرے بغیر زندگی گزارنا ہوگی۔ منہ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہم بازو میں بازو ڈالے اس کے سامنے گزر جائیں گے اور وہ سب سمجھو جائے گا۔ وہ بڑا ذہین ہے۔ اس کی بصیرت میں بہت

تیز ہیں۔“

«بشرطیکہ آٹھ نہ ہوا،» مختار نے کہا: «آٹھ نہ ہوا تو وہ کچھ نہ کچھ کر دیجے گا۔» رخشی بولی: «معلوم ہوتا ہے تم اسے جانتے تو ہو مگر تھیک سے نہیں جانتے۔ وہ شور بہت مچاتا ہے مگر آٹھ بہت نکم ہوتا ہے۔ شراب کی عادت ہو گئی ہے۔

شراب وہ اسی طرح پیتا ہے جیسے چلتا ہے یا سانس لیتا ہے۔ چلو انھوں۔“
اندر ہاہر کھلنے والا دروازہ اندر کھلا تو کلب میں ایک بار پھر ایسی فضناپیدا ہو گئی
جیسے محمود نے بوتل فرش پر دے ماری ہے۔ رخشی اور مختار شناساؤں سے ہیں یہو ہمیدو
کہتے جب محمود کی خاص میز کے پاس پہنچ تو ایک دیر طشت میں بوتل کی کرچیاں جمع
کر رہا تھا۔

رخشی جیسے سب سمجھ گئی۔ دیر سے پوچھا۔“ یہ بوتل محمود نے خود توڑی یا ٹوٹ
لگئی؟ ”

”خود توڑی جی۔“ دیر بولا۔“ کچھ کر فرش پر دے ماری اور اٹھ کر جائے گئے۔“
رخشی نے ایک لمحہ سوچا۔ پھر بولی۔“ تو پھر تارے پیارے۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔
ہمیں اس سے نہیں ملنا چاہیئے۔“

وہ روزانہ ایک ہو ٹوں بدلتے تھے اور اب تک چار ہو ٹوں بدلتے تھے پانچویں
ہو ٹوں میں قدم رکھتے ہی مختار بولا۔“ رخشی دیر۔ میرا جی چاہتا ہے میں نگینہ کو دیکھوں کہ
وہ میرے بغیر کیسی ہے۔ یقین کرو دیر، اگر مجھے تم نہ ملتیں تو میں دُنیا کی کسی بھی عورت
کے لئے نگینہ کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں اسے کبھی کبھی گریٹ بیوی گھستا تھا۔ مجھے کیا معلوم
تھا کہ رخشی کے روپ میں ایک سپریم بیوی بھی موجود ہے۔“

” یہ تو میں مانتی ہوں۔“ رخشی بولی۔“ خوبصورت تو وہ بلا کی ہے اور یاد رکھو۔ میں
دُنیا کی پہلی عورت ہوں جو دوسرا عورت کی خوبصورتی کا اعتراف کر رہی ہے۔“
یہاں رخشی نے اپنی ہنسی کا عجاذ کھایا۔“ بس تم نے اس کی جواباتیں مجھے بتائی
ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنا خوبصورت اس کا جسم اور چہرہ ہے، اتنا ہی بھونڈا
اس کا دل اور دماغ ہے۔ دیسے یاد رکھو دہ بھی محمود کی طرح تمہیں اور مجھے قتل کر سکتی ہے۔

جو بیوی اپنے شوہر کو صبح تھپڑا مار کر جگاتے اور ٹھوکر مار کر اٹھاتے، وہ سب کچھ کر سکتی ہے،“

”اور پھر کہتی ہے کہ میں نے تو پیار سے تھپڑا مارا، میں نے تو پیار سے ٹھوکر ماری“ مختار بولا۔

”لوپھر وہ پیار سے رویا اور کی گولی بھی اُمار سکتی ہے دوسرا کے سینے میں“ رخشی نے کہا۔

”نہیں ایسی بات نہیں“ مختار نے رخشی کی تردید کی ”ایسے معاملات میں گولی نہیں ماری جاتی ہے جن سے محبت کی جاتی ہے۔ اس سے محبت میں نے کی ہے۔ اس نے نہیں کی اور وہ ایسی پاگل نہیں کہ راہ چلتے کو گولی مار دے۔ دیکھو نہ ڈیکھو، ہم چار پانچ روز سے ہو ٹلوں میں بھکتے پھرتے ہیں اور سب فائیو سٹار ہو ٹل ہیں۔ اسے تشویش ہوتی تو وہ کسی ہو ٹل سے میرے بارے میں پوچھتی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے نکاح کے وقت اپنا جو بیگلہ اس کے نام منتقل کر دیا تھا تو وہ اسی پر صابر و شاکر ہو گئی ہے۔“

”تو پھر تمہیں یہ دیکھنے کا شوق کیوں ہے کہ وہ تمہارے بغیر کیسی ہے؟“

”جیسے تمہیں محمود کو دیکھنے کا شوق تھا؟“

”مگر وہ شوق تو محمود کو دیکھے بغیر پورا ہو گیا“ اور یہ کہہ کر رخشی نے اپنی ہنسی کے ذریعے چاندی کی ننھی گھنٹیاں بجا میں۔

ملگر پھر لوں ہو اک گھنٹیوں کی یہ آوازیوں بیچ ہی میں کٹ کر رہ گئی جیسے کسی دیونے تڑپتی ہوتی گھنٹیوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔

سامنے کے دروازے میں سے محمود اور ٹکینہ، بازو میں بازو ڈالے ہال میں داخل ہوتے۔ دونوں کے بیوی پر وہ مسکراہیں تھیں جو آنکھوں کو بھی چمکا دیتی ہیں اور پھر وہ

کو بھی دملکا دیتی ہیں ۔

مختر اور رخشی دونوں جیسے بھلی کے ایک چھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوتے اور جب وہ آئتھے تو محمود اور نگینہ کے قدم جیسے فرش کی ٹاملوں نے کپڑے لئے۔ طرفین ایکدوس کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے برسوں کے بعد ملے ہیں تو پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے۔ پھر ادھر سے مختار اور رخشی اور ادھر سے محمود اور نگینہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ رخشی محمود سے خوف زدہ ہے اور مختار نگینہ سے۔ مگر پھر یوں ہوا کہ محمود نے قریب آ کر کہا۔ «ہیلو مختار» اور رخشی کے بازو میں بازو ڈال کر پلٹا تو مختار بولا۔ «ہیلو»

«ہیلو» نگینہ نے بازو اٹھاتے بغیر جیسے اپنا پورا جسم مختار کے جسم میں پیوست کر دیا اور پھر اس کے بازو میں بازو ڈال کر دوسری سمت چل پڑی ۔

سارا معاملہ یوں چپ چاپ طے پا گیا جیسے دونوں مال کا تبادلہ کرنے آئے

ایک عورت تین کہانیاں

میں گاؤں کی نخنی سی ایک بچی ہوں۔ میرا نام فور خاتون ہے۔ میں نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی ہے کہ اگر خدا نے میری پیدائش کے فوراً بعد مجھے عقل و شعور سے بہرہ دو کر دیا ہوتا تو میں ایک ہونا ک جیخ مار کر مر جاتی۔ میں اشرف المخلوق کے ایک فرد کی حیثیت سے دُنیا میں آتی تھی۔ مگر میں نے جس کو تھے میں جنم لیا، وہ مرت کی طرح تاریک تھا۔ اس کے ایک کوئے میں میرے باپا کی اکلوتی بھری بندھی تھی جو بیٹھے بیٹھے تھاک جاتی تھی اور اُنھوں کے ایک جھر جھری سے اپنا جسم جھاڑتی تھی تو اس کی غلاظت اُڑ کر میری چیختی ہوتی ماں کے بالوں میں اُنک جاتی تھی۔ میرے پیدا ہوتے ہی دُنیا کی جس پلی چیز نے میرا استقبال کیا وہ اس غلاظت کا ایک چھینٹا تھا، جو سیدھا میرے مانچے پر آگرا اور میری تقدیر رکھ گیا۔ یہ انگ بات ہے کہ اس کے بعد میرے کان میں اذان بھی دی گئی اور مجھے پیغامبروں میں پسیط بھی لیا گیا مگر غلاظت کا چھینٹا اس سے پہلے ہی اپنا کام کر چکا تھا۔

میری آمد پر میری ماں دونوں تک روتنی رہی۔ میرے باہنے بھی مجھے دیکھا، تو ایسا ٹھاٹھا نظر آ رہا تھا جیسے اس کی بکری اچانک کھڑی کھڑی ڈھیر ہو گئی ہے۔ عورتیں میری ماں کے ساتھیوں اظہار ہمدردی کرتی تھیں جیسے اس کے ہاں کوئی پیدا نہیں ہوا ہے،

کوئی مر گیا ہے۔ اس کے باوجود میں اپنی ماں کی آنتوں کا ایک ٹھکردا تھی۔ وہ مجھے سینے سے چھٹاتے رکھتی اور میری ناخنی ٹھوڑی کو اپنی ایک انگلی کی پورے دبادبا کر مجھے ہنسانے کی کوشش کرتی رہتی، پھر جب میں مسکرانے لگتی تو وہ روٹے لگتی اور میرے بابا سے کہتی ہے: "اس کی طرف دیکھو، میں نے اس کی ٹھوڑی کو زرا سا چھوپیا تو مسکرانے لگی۔ اللہ رحم کرے، یہ مسکراتی بہت ہے"۔

چند دنوں کے بعد میری ماں نے چارپائی سے اُتر کر بکری کی میلنگنیاں سکھانا، دودھ نیچنا، دال ایالنا، اور روٹیاں پکانا اثر فرع کیا، تو میں ایک فالتو چیز بن کر رہ گئی۔ اتنی فالتو کو ایک بار تو بابا مجھ پر بیٹھتے بیٹھتے رہ گیا۔ بیٹھ جاتا تو میں ردنی کا ذرا سا گالا لای تو تھی، پچک کر رہ جاتی، مگر بابا بیٹھنے کو بھکا ہی تھا کہ ماں نے چین مار دی اور وہ تڑپ کر سیدھا ہو گیا۔ پھر اس نے کہا: "تو ہے ہے، میں سمجھا کوئی چیختھڑا پڑا ہے۔ یہ کبھت کیسی ہے کہ روٹی بھی نہیں" اور ماں نے کہا تھا: "بیٹیاں بیچاری تو ٹری صابر ہوتی ہیں۔ روٹے تو بیٹھے ہیں"۔

گرتی پڑتی میں اتنی بڑی ہو گئی کہ بیٹھ بیٹھ پورے سحن میں گھوم آتی تھی۔ مجھے جو چیز بھی ملتی اسے پکڑ کر منہ میں ڈال لیتی مگر ان دنوں میرے منہ میں کچھ گیا تو وہ لکھ رہے یا بھوسے کے تنکے، بکری کی میلنگنیاں یا مٹی کے ڈھیلے۔ گھر میں اور تھاہی کیا کہ میرے قبضے میں آتا۔ ایک بار چوہے میں سے انگارہ اٹھا کر بھی چکننا چاہا گرمان نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مارا اور گالیاں دینے لگی اور رو رو کر میرے بابا سے کہنے لگی کہ بیچاری کے لئے ایک آنے کا جھنجھنا لادو۔ مگر بابا بولا: "ایک آنہ ہوتا تو تباکون لے آتا۔ دیرے حق کے لئے ترس رہا ہوں"۔

اب میں سات آٹھ برس کی ہوں۔ ہمارے پڑوں میں چودھری پیراں دتہ کا گھر ہے، جس کی بیٹیوں کے پاس انگریزی گڑیاں ہیں جو بیٹی ہیں تو آنکھیں بند کر لیتی ہیں اور

اٹھتی ہیں تو ڈکھ رکھ گھورنے لگتی ہیں اور ان کے سنبھالی بال ہیں اور گالوں پر لالی ہے۔ ماں نے مجھے بھی کپڑے کی ایک چھپی سی گڑیا بنائی کر دی مگر یہ چودھرانیاں کہتی ہیں کہ میری گڑیاں گڑیوں کی میراث ہے۔ اسی لئے میری ان کی دوستی نہیں ہو سکی۔ میری دوستی تو تو گامے موچی کی بیٹی تاروں سے ہے جو ننگے پیر رہتی ہے۔ ایک بار میں نے کہا: ”موچی ہو کر ننگے پیر رہتی ہو۔ یہ بھی کیا بات ہوتی ہے؟“ وہ بولی: ”وہی بات ہوتی ہے جیسے تم کسان کی بیٹی ہو کر بھوکی رہتی ہو۔“ میرا اس کا حساب برابر ہو گیا اس لئے میری اس کی دوستی ہو گئی۔ میں دوسری لڑکیوں کی طرح مدرسے نہیں جاتی۔ بابا مجھے قاعدہ، فلم، تختی، سلیٹ خرید کر نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ ”بیٹی تھیں منشائی نہیں بننا ہے۔ اپنی ماں کی طرح مینگنیاں سکھانی ہیں۔ یہی تمہاری نانی دادی نے کیا۔ یہی ان کی نانیوں دادیوں نے کیا اور پھر اگر میرے پاس تختی سلیٹ کے پیسے ہوتے تو میں دوسری بکری نہ خرید لیتا۔“ میں صبح سوریے گھر میں جھاؤ دیتی ہوں۔ بکری کے تھان صاف کرتی ہوں کنونیں پر سے پانی کی لگڑیا بھر لاتی ہوں۔ جنگل میں جا کر جھاؤیوں کی خشک ٹہنیاں توڑ لاتی ہوں۔ مانی جی سے روزانہ نماز کا سبق لیتی ہوں۔ آج کل میرا سبق ہے صراط الدین انعمت علیہم۔ وہ کون سا کام ہے جو کسان عورتیں کرتی ہیں اور میں نے اس عمر ہی میں نہ کر لیا ہو۔ میں نے مٹی کھو دی ہے، گھاس کاٹی ہے، دیواریں لیپی ہیں۔ میرے ہاتھوں پوچھتے ہیں۔ میری اڑیوں میں دراڑیں ہیں، میرے بالوں میں دھول ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ میرے ہونٹوں پر پڑیاں ہیں اور پچھلی چودہ پندرہ عینہ دن میں میری ہتھیاری مہندی کے ایک دھنے تک کے لئے ترسی رہی ہیں۔

(۲)

میں گاہوں کی ایک کنواری ہوں۔ میرا نام نورخا توں ہے۔ میرے کپڑے ٹیکے ہیں مگر میری آنکھوں میں چراغوں کی دویں کاپنی ہیں۔ میرا کرتہ جگہ جگہ سے

مسک گیا ہے مگر میرے چہرے پر حیا کی گلابی چادر ہے۔ میرے سر پر لانبی لانبی
گھاس کامن بھر گئی ہے مگر میرے ہونٹوں پر ہلکے چلکے گیت ہیں۔ میں ایک اپنے
بaba ہی کی نہیں، سارے گاؤں کی عزت ہوں مگر کیا کروں کہ آخر ایک عورت ہوں
اور صد یوں سے عورت کو دیکھتے رہنے والے مرد اسے اب تک یوں انگھیں چھاڑ
چھاڑ کر دیکھتے ہیں، جیسے میں کچپن میں ہواں جہاڑ کو دیکھتی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ میں گاؤں
کی پلی گلی میں داخل ہوتے ہی بیسوں نگاہوں کا نشانہ بن جاؤں گی اور نگاہوں کے
اس ہجوم میں روکھڑا نے لوگوں گی۔ گاؤں میں اور جوان لڑکیاں بھی ہیں اور مرد انہیں بھی
دیکھتے ہیں مگر یوں، ہجوم کر کے نہیں دیکھتے جیسے مجھے دیکھتے ہیں۔ مجھ پر نگاہوں کی اس بیگناہ
کے دو سبب ہیں ایک تو یہ کہ تاروں نے مجھے بتایا ہے کہ میں خوبصورت ہوں۔ خود تاروں بھی
خوبصورت ہے مگر وہ کہتی ہے کہ کسانوں تک آکر خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے اور سوچنیں،
ناشیں، دھوپنیں، میراثیں اور کمائیں خوبصورت نہیں ہوتیں۔ وہ صرف موچنیں
ناشیں، دھوپنیں، میراثیں اور کمائیں ہوتی ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ میرا بابا چھلے
سو لے سترہ سال سے بدستور ایک ہی بکری کا مالک ہے اور گاؤں کی چوپال پر جا کر چھپا پ
بیٹھا رہتا ہے کیونکہ غریب ہونے کی وجہ سے اس کی بات میں وزن نہیں ہوتا۔

گھاس کا گھٹا اتار کر وہ سب کام کروں گی جو میری ماں اور اس سے پہلے اس
کی ماں اور اس سے بھی پہلے اس کی ماں کرتی رہی ہے۔ میں چولھا چونکوں گی۔ ٹروں
کے چودھروں سے گائے بھیں کا گوبر مانگنے جاؤں گی اور اگر مل گیا تو اپنے تھاپوں گی،
چھاڑ دوں گی، گارا بناوں گی۔ چھت اور دیواریں لیپوں گی، بابا کے نئے حکیم جی سے
ادھار عرق لاؤں گی۔ ماں کے لئے پیر جی سے ادھار تعویذ عاصل کروں گی، پھر جب
رات کو چھتھیڑوں کے انبار میں سونے کی کوشش کروں گی تو میرے ماں اور بابا آپس
میں کھسر پھسکریں گے۔ وہ کچھ ایسی باتیں کریں گے جیسے میں ان کی بیٹی نہیں ہوں، میت

ہوں اور وہ میری شادی کا نہیں سوچ رہے ہیں، میرا جنازہ اٹھانے کی فکر میں ہیں۔
 اس وقت میری ماں میرے بابا کو بتائے گی کہ وہ اپنی شادی پر چاندی کے جو
 لفگن لاتی تھی وہ اس کی بیٹی کے جہیز کے لئے محفوظ پڑے ہیں۔ یہ لفگن میری ماں کو
 اس کی ماں نے دیتے تھے اور اسے اس کی ماں نے دیتے تھے اور کہتے ہیں کہ یہ لفگن
 اس زمانے کے ہیں جب پنجاب پر سکھوں کا راج تھا اور دلی کا بادشاہ جیتے جی مر گیا تھا۔
 پھر بابا بتلتے گا کہ وہ اپنی بیٹی کی خاطر بکری بیج دے گا اور گزر بسر کے لئے کھیتوں پر
 مزدوری کرے گا یا چوہدہ ری کے جو نئے مکان بننے والے ہیں ان کے لئے مگاراڑھوئے گا۔
 میری ماں روتے رہتے کھانسے لگے گی تو پانی میں پیر جی کا تقویڈ گھول کر پی جاتے
 گی۔ میرا بار دنے پر ضبط کرتے کرتے ہانپنے لگے گا تو عرق کا ایک گھونٹ چڑھا لے گا
 اور میں یوں محسوس کر دن گی جیسے میں جوان نہیں ہوتی ہوں، مر گئی ہوں۔ میں ایک بہت
 گھری، بہت ہی گھری قبر کے کنارے پہنچ گئی ہوں اور میرے ماں اور بابا مارے مجتہت
 کے بھئے اس میں دھکا دینے والے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں اس کنوں کی سی قبر کے
 دوسرا سے سمرے پر وہ سورج نکل آتے گا جو کبھی نہیں ڈوبتا۔

میں عجیب عجیب باتیں سوچتی ہوں۔ میں کسے بتاؤں کہ میں کیسی کسی باتیں
 سوچتی ہوں۔ میں تاریخ موجن سے سب کچھ کہہ کر اپنا جی ہلکا کر لیتی مگر وہ تو سال بھر پہلے
 بیاہ دی گئی اور ابھی چند روز پہلے اپنے مردہ پتھے کے ساتھ ہی مر گئی۔ ایک بار جب
 اسے ہوش آیا اور اسے پتہ چلا کہ اس کے ہاں تو مردہ پتھے پیدا ہوا ہے تو وہ تھیخنے
 لگی۔ ”لا لا“ میرا بچتہ لاؤ۔ میں اس میں اپنی جان پھونک دوں گی۔ میں اپنے پتھے سے
 اس کی موت لے ووں گی اور اسے اپنی زندگی دے دوں گی۔ میرا خدا بڑا اچھا
 ہے۔ اس کو اس سودے پر کیا اعتراض ہو گا؟“ پھر وہ مردہ پتھے سے جھٹ
 گئی اور مر گئی مگر بچتہ زندہ نہ ہو سکا۔

پڑوس کی ایک لڑکی کی شادی پر میں نے دوسری بہت سی لڑکیوں سے مل کر گیت گاتے تھے تو نمبردار کی بیٹی چونک پڑی تھی اور اس نے سونے کی چوڑیوں سے پی ہوئی بانہہ اٹھا کر سب کو خاموش کر دیا تھا اور مجھے کہا تھا: "اب تو گافور یئے! کوئی اور نہ گاتے۔ صرف فوری گاتے گی۔ اس کی آواز میں پتیں کا گٹورا بھتا ہے!" پھر میں نے اگ سے گایا تورو نے لگی اور بولی: "ہاتے ری اور گا۔ گاتی جا۔ تیری آواز میں تو پھر یاں کھنکتی ہیں!" پھر نہ جانے کیا ہوا کہ گاتے گاتے میں خود بھی رو نے لگی اور یوں آنسوؤں کے تاروں نے نمبردار کی بیٹی کو اور مجھے دوستی کے بندھوں میں جکڑ لیا۔

مگر پھر یہ دوستی عجیب طرح ٹوٹی۔ ایک روز جب میں اس کے پاس بیٹھی ہوئے ہوئے گاہری تھی اور وہ ردرہی تھی تو مجھے بھی رونا آگیا۔ اب میں کیا بتاؤں کہ مجھے رونا کیوں آیا۔ بس یونہی میرا جی چاہا کہ رونا چاہیئے درنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔ تب یوں ہوا کہ اس نے آنچل سے اپنے آنسو پوچھے، اٹھی اور واپس آکر مجھے پانچ روپے دیتے کہ جان سے ایک کرٹے کا کپڑا خرید لے۔ مجھے ایسا لگا کہ اس نے میرے گانے کے جواب میں مجھے گالی دی ہے۔ میں نے صرف اتنی سی بات کہی کہ بی بی تو نے اپنے آنسو تو آنچل سے پوچھے اور میرے آنسو پوچھنے کے لئے پانچ روپے اٹھا لائیں! کیوں؟ کیا میرے آنسو فال تو ہیں؟ میں نے یہ کہا اور پھر وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔

اب میں اکیلی ہوں۔ میرے ماں اور بابا بھی اب مجھے کوئی بات نہیں کرتے۔ وہ مجھے صرف دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں۔ اور پھر میں دضو کر کے نماز پڑھنے لگتی ہوں اور نماز پڑھتے ہوئے سوچتی ہوں کہ میری جوانی بھی عجیب جوانی ہے کہ میرے ہونٹ۔ سُرخ تو ہیں مگر شعلوں کی طرح سُرخ ہیں۔ میری آنکھوں میں چمک تو ہے مگر ریت بھی تو چکتی ہے میری رگوں میں خون کی جگہ آنسو دوڑتے ہیں اور میں اُپر سے سانس لے رہی ہوں مگر اندر سے چمنخ رہی ہوں۔

(۳)

میں گاؤں کی ایک عورت ہوں۔ میرا نام فور خاتون ہے۔ میں بہت دُلھی ہوں۔ میں اس لئے بھی بہت دُلھی ہوں کہ میری پانچوں بیٹیاں زندہ ہیں اور میرا گھر دالا مکان کی چھت کے لئے منٹی کھودتے ہوتے مٹی کے ایک توڑے تلمے دب کر مر گیا ہے۔ جب اس کی لاش گھر میں لائی گئی تو اس کے نتھنوں اور کافنوں اور آنکھوں میں ٹھی بھری ہوتی تھی اور اس کے ہونٹوں سے خون کی ایک دھار نکل کر اس پاس کی منٹی میں اگر مل گئی تھی اور منٹی کا عجیب سازگر ہو گیا تھا جیسے گرہن لگنے تو چاند کا زنگ ہو جاتا ہے۔ میرے اکلوتے بیٹے کا بھی یہی زنگ ہے۔ وہ گاؤں کے ایک بڑے آدمی کا مزارعہ ہے۔ اس کی زینتوں پر ہل بھی چلاتا ہے۔ اس کے لئے لکڑیاں بھی کاٹ لاتا ہے، اسے مرغیوں کے انڈے بھی جمع کر کے دیتا ہے، وہ سفر پر جاتے تو اس کا تحیلا اٹھا کر اس کی گھوڑی کے ساتھ ساتھ جھاگلتا ہے۔ وہ تھک جاتے تو اس کا جسم دا بنا ہے۔ ایک روز کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کے جسم گوشت سے نہیں رسیم سے بنے ہوتے ہیں۔ ذرا سائبے دقوف ہے لیکن محنتی ہے۔ اس لئے مجھے اس کی بے دوقنی کھلتی نہیں۔

ایک دن اس نے کہا تھا۔ ”ماں جن دیے توبڑی پیاری چیز ہے مگر یہ کیا بات ہے کہ جب میں اپنی پانچ بہنوں کو دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میرے سینے میں پانچ چاقواڑے ہوتے ہیں۔ ماں انہیں زیادہ باہر نہ جانے دیا کرو، ماں انہیں چھت پر نہ چڑھنے دیا کرو۔ ماں انہیں کسی کوٹھے میں بند کر دو۔ ماں انہیں کسی ستون سے باندھ دو۔ ماں انہیں زہر دے کر مار ڈالو۔ میں ان کی شادیاں نہیں کر سکوں گا۔ شادیاں نہ کر سکا تو ان پر پھرے نہ دے سکوں گا۔ پھرے نہ دے سکا تو میں گاؤں والوں کی باتیں نہیں سن سکوں گا اور پھر یا مار ڈالوں گا یا مر جاؤں گا۔“

میرا بیٹا پاگل نہیں ہے۔ وہ ذرا سابے دقوف ہے۔ جھوٹا تھا تو اچھا بھلا
سیانا تھا۔ پھر جب اسے عقل آنے لگی تو بے دقوفی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کہتا تو سچ ہے
مگر سچی بات ہی بے دقوفی کی بات ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے جس گھر میں ایک وقت
سو کھی روٹی پر اور دسرادقت بخشنے ہوتے دافوں پر بس رہوتی ہو، وہاں جہیز کہاں سے
آئے گا اور جہیز نہیں ہو گا تو بہ کہاں سے آئے گا۔ — وہ سچ کہتا ہے غریب
راہ کے موجود ہیں مگر وہ اپنے سے بھی زیادہ غریب لڑکیوں سے کیوں شادی کریں۔
ہم سے بھی زیادہ غریب گھرانے موجود ہیں۔ یہی ہمارا پڑوسی احمد دین ہے۔ اس کے
صحن میں دو بیڑیاں ہیں۔ بیر پکتے ہیں تو وہ ان بیڑوں کو جمع کر کے سکھا لیتا ہے اور
جب غلنے کا توڑا پڑتا ہے تو ان خشک بیڑوں کو اکھلی میں کوٹ کر مٹھی مٹھی سارے گھر
والوں کو بانٹ دیتا ہے اور سونے سے پہلے "شکر الحمد للہ" کہتا ہے۔ احمد دین ٹرائیانا
ہے۔ میرا بیٹا ذرہ اسابے دقوف ہے۔ وہ کہتا ہے اپنے سے بھی غریب گھر میں تو
میں اپنی بہنیں کبھی نہ بھیجوں تو پھر میں کیا کروں! اے خُدا، میں کیا کروں — اے
انسانو، میں کیا کروں؟

کاش میں پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ کاش میں تار و موجن ہوتی اور اپنے پہلے مردہ
پنچ کے ساتھ ہی قبر میں اُتر جاتی۔ میں نے اتنی لمبی زندگی کو پاکر کیا پایا۔ میں تو سوچتی ہوں
کہ بظاہر میں آدھی صدی کی ہی مگر میری عمر توکل ایک سال کی ہے۔ وہ ایک سال
جو میں نے شادی کے بعد اپنے گھر والے کے ساتھ پڑوں کے بغیر بس رکیا۔ پھر پنچے
آنے لگے۔ ہر پنچ کے ساتھ میرا گھر والا مجھ سے پچھے ہستا گیا اور آخر اتنا ہٹ گیا کہ
چھپ گیا۔ مونوی جی کہتے ہیں کہ دوح محفوظ میں یہی لکھا تھا۔ میں سوچتی ہوں جب
دوح محفوظ پر میری قسمت لکھی جا رہی تھی تو کیا فرشتوں کا قلم ٹوٹ گیا تھا۔
نمبردار کی بیٹی اب کسی افسر کی بیگم ہے۔ سبز رنگ کی کوٹھی جتنی لمبی کار میں

ایک بار گاؤں آتی تو کار کو گاؤں کی بڑی گلی میں گھسالاتی۔ میں سر پر دد گھڑے رکھے پانی بھرنے جا رہی تھی۔ بولی: کیسی ہو؟ اس نے یہ سوال یوں پوچھا جیسے کہ رہی ہے کہ بد نصیب! اس روز مجھ سے پانچ روپے کیوں نہیں لے لئے تھے کہ تیری بگڑی بن جاتی۔ میں نے کہا: میں ٹھدا کے فضل سے دیسی کی دیسی ہوں۔ قم بتا، تم کیسی ہو؟ اور وہ تیموری چڑھا کر چلی گئی۔

کہتے ہیں اس نے گاؤں کی بہت سی عورتوں کو جمع کر کے بتایا کہ دہاں شہر میں بڑی بڑی عورتیں چھوٹی چھوٹی عورتوں کی بڑی مدد کرتی ہیں۔ سال میں ایک دو بار دیگریں پکا کر ان کے پیچوں کو مشیخ چاول کھلاتی ہیں اور انہیں دودھ کا سفوف دیتی ہیں۔ اب انہوں نے گاؤں گاؤں جانے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

نا بہنو، ادھرنہ آنا۔ یہاں گاؤں میں تو پاکستان کی چار کروڑ عورتیں بستی ہیں۔ پہلے تم شہر کی آدھ پون کر دوڑ عورتوں سے قوبیٹ لو۔ تم تو انہیں کے آنسو جمع کر د تو کتنے تالاب بھر جائیں گے۔ یہاں آڈگی تو آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب جاؤ گی۔ قم جو پیدل چلو تو تمہیں بخار آ جاتے۔ تم ان سنگ زاروں اور خارستاؤں کے کڑے کوس کیسے طے کر دو گی؟ نا بہنو، نا۔ خود کشی مت کر د۔

مگر یہ میں باتوں میں کہاں نہ کن گئی۔ اس وقت میری بیٹیاں قطار میں بیٹھی ایک دوسری کی جو تینی دیکھ رہی ہیں۔ میرے بیٹے کے ہل کی چھال ٹوٹ گئی ہے اور وہ لہار سے نتی پھال بنوانے کے لئے کہیں سے قرض لینے لگا ہے۔ میں ملکے کا ڈھکنا اٹھاتے سوچ رہی ہوں کہ نتی فصل اٹھنے میں تو ابھی چار سینے باقی ہیں اور ملکے میں تو چار دن کا بھی انداج باقی نہیں۔

نہ ملکے میں انداج ہے، نہ صندوق میں کپڑا ہے، نہ جیب میں پسیہ ہے۔ اگر کچھ ہے تو آنکھوں میں آنسوؤں کی چنگاریاں ہیں اور دل میں جیسے کسی نے

بھروس کے چھتے کو چھیر دیا ہے اور ہنٹوں کی اکٹی ہونی پڑیں میں یہ دعا اٹھی
ہوئی ہے کہ الٰہی! تو جو ایک کو لاکھوں دے ڈالتا ہے۔ لاکھوں کو ایک ایک
تو عطا کر دیا کر۔ ہم بڑے شاکر اور صابر لوگ ہیں۔ ہم خون کے گھونٹ پی کر بھی
جی سکتے ہیں، مگر گوں میں خون بھی تو ہو۔ ہم مٹی چاٹ کر بھی زندہ رہ سکتے ہیں
مگر مشکل یہ ہے کہ ہم سانپ نہیں ہیں۔ ہم تو اشرف المخلوق ہیں۔ ہم تو زمین
پر تیرے خلیفے ہیں۔

— ۱۹۶۲ء —

ایک احمد قانہ محبت کی کہانی

جس رات تمہارے آباجان نے مجھے کھانے پر مدعو کیا تو وہ خوش بھی تھے اور حواس باختہ بھی۔ وہ اپنے ایک پُرانے ہم مکتب سے ہل کر خوش تھے، مگر انپر بیوی کی وجہ سے حواس باختہ تھے۔ دوسرے دن صبح انہوں نے مجھے تباہ کر رات ان کی بیوی تمیں جنم دے کر رُخت ہو گئیں۔

اب تم انہیں بیس برس کی عالیہ ہوا اور میں اکتالیس سال کا صدیقی احمد ہوں، اور تمہارے آباجان نے چند روز پہلے اپنی سینتا لیسویں سالگرہ مناتی تھی۔ عمر دن کا یہ تفاوت بظاہر طویل فاصلے پیدا کر دیتا ہے، مگر عالیہ! یہ فاصلے کتنے بے حقیقت کتنے بے مفہوم ہیں! اور اگر ان کا کوئی مفہوم ہے تو قم، جو غُر کے معاملے میں مجھ سے اتنی دور ہو، مجھے اتنی پیاری کیوں ہو کہ میں تمیں ہر وقت اپنی شہزادگ سے بھی قریب محسوس کرتا ہوں۔

تمہارے آباجان میرے ہم جماعت تو نہیں تھے، البتہ ہم مکتب ضرور تھے۔ میں پہلے سال میں تھا اور وہ آخری سال میں تھے، مگر ایک سال تک ہم ایک ہی گرد پ میں رہے اور ایک ہی کھیل کھیلتے رہے۔ پھر وہ فارغ التحصیل ہو کر کہیں چلے گئے اور جب اس کے کوئی چھ سال بعد میں ایک غیر ملکی فرم میں ایک اسائی

کے لئے انٹرویو دینے آیا، تو میں نے پہلی ہی نظر میں انہیں پہچان لیا۔ مجھے ان کے بیٹھنے اور کھفتگو کرنے کے انداز سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ باقی دونوں افسروں سے بھی ڈرے افسر ہیں۔ انہوں نے جب میری درس گاہ کا نام سنا تو چونکے۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ اپنی مسکراہست کو چھپا رہے ہیں، مگر عالیہ، تمہیں تو معلوم ہی ہو گا کہ انسان قتل تک کو چھپا سکتا ہے، مگر اپنی مسکراہست نہیں چھپا سکتا۔ مسکراہست ہر فہرست ہوں گے کی محتاج نہیں ہوتی ہوں گے پر قابو پا لو تو انکھیں مسکرانے لگتی ہیں۔ انکھیں جھکا لو، تو چہرے کی نگت مسکرانے لگتی ہے۔ میں حسابی کتابی آدمی، مجھے ان نازک چیزوں کا علم قطعی نہیں ہو سکتا تھا، مگر شاید تمہیں یاد نہ ہو، جب تم پہلی بار مسکراہست تھیں تو بالکل اس طرح مسکراہست تھیں کہ تم مسکراہست کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی تھیں، مگر یہ تمہاری آنکھوں اور تمہارے چہرے، حتیٰ کہ تمہارے کاؤن کی لوؤں تک سے ٹیکی پڑ رہی تھی۔

تمہارے آپا جان مسکراہست چھپانے کے باوجود آنکھوں سے مسکرا دیتے اور میں سمجھ گیا کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے، مجھ سے بہتر قابلیت کے امیدواروں پر بھی ترجیح دی اور میں اس فرم کی ایک اہم اسمی کے لئے چُن لیا گیا۔ انٹرویو ختم ہوا اور میں باہر آیا تو کچھ دیر کے بعد ایک چپر اسی نے آکر مجھ سے پوچھا:

”میا آپ کا نام صدیق احمد ہے؟“

”ولا: آپ کو ڈرے صاحب بلا رہے ہیں؟“

پھر اپنے دفتر میں وقار بھائی مجھ سے لپٹ گئے اور بولے: ”میں نے تمہیں پہچان لیا تھا، مگر انٹرویو میں اس کا اظہار ٹھیک نہ ہوتا۔ سمجھ گئے نا،“

ظاہر ہے کہ میں سمجھ گیا تھا۔

پھر انہوں نے مجھے رات کے کھانے پر مدعا کیا اور عالیہ! یہ اسی رات کا ذکر ہے

کہ تم پیدا ہوئیں۔

میں پانچ سال تک وقار بھائی کی فرم میں رہا جب مجھے اس سے بہتر نکری مل گئی، تو خود وقار بھائی نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے دہاں چلے جانا چاہیے۔ سو جب میں لاہور سے کراچی کی طرف چلا، تو تم نزمری کلاس میں جانے لگی تھیں اور مجھے صدیقِ انگل کہتی تھیں اور بہت موٹی اور لال گلابی لڑکی تھیں اور خوب صدمی تھیں اور خوب روتنی تھیں۔ تمہارے نقوش تمہارے چھوٹے ہوتے گاؤں میں دبک گئے تھے۔ تمہیں لان میں تسلیوں کے پیچھے بھاگتا دیکھ کر ایک دن میں نے وقار بھائی سے کہا تھا کہ عالیہ کو دیکھ کر کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی پہلوان سکڑ گیا ہے۔ میں جب وقار بھائی سے رخصت ہونے آیا اور تمہیں بھی بتایا گیا کہ صدیقِ انگل کراچی جا رہے ہیں، تو تم نے صرف اتنی بات کہی تھی کہ ہم بھی کراچی آئیں گے اور جب میں تمہارے گاں کو تھپتی چھپا کر اور تمہاری بیشاںی کو چومن کر چلا آیا تھا، تو مجھے تم مددوں تک یاد نہیں آئی تھیں۔ صرف جب وقار بھائی کو کبھی کبھار خطا لکھا تو تمہیں دعا تھیں لکھ دیں۔ میں کراچی سے ڈھاکے چلا گیا اور دہاں سے صرف ایک بار، آج سے یہی کوئی دو تین برس پلے لاہور آیا۔ میں وقار بھائی سے بھی ملا، مگر اس وقت تم کا لمح لگی ہوئی تھیں، سو میں تمہیں نہ دیکھ سکا، چنانچہ یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ تم کا لمح لگی ہوئی تھیں میرے ذہن میں تمہارا وہی پرانا تصور قائم رہا کہ تم ایک موٹی، گول مٹول تھی متھنی سی لڑکی ہو اور بہت چڑوری ہو اور سخت صدمی ہو اور بات پر رونے لگتی ہو۔

آج سے کوئی ایک برس پلے وقار بھائی نے مجھے ڈھاکے سے بلا لیا۔ ان کی فرم میں ایک نہایت عمدہ اسمی خالی ہوئی تھی اور وہ مجھے بخوبی نہیں تھے۔ میں واپس آیا۔ پھر کو ان کے نہیاں میں چھوڑ کر جب میں لاہور میں وقار بھائی کی کوٹھی پر آیا، تو تم باہر لان میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ میں نے سلام کیا، تو تم اٹھ کھڑی ہوئیں اور

کہا: ”فرمایتے؟“

تماری آواز عام رذکیوں سے اوپنجی تھی مگر اس میں جو گونج تھی وہ عام رذکیوں کی آواز میں نہیں ہوتی۔ آواز کی یہ گونج آواز والی کی صورت کے بارے میں عموماً دھوکا دے جاتی ہے، مگر تم تو اپنی آواز کی گونج کی طرح خوبصورت تھیں تم اتنی خوبصورت تھیں کہ اگر میں ایک بیوی کا شوہر اور پچھوٹن کا باپ نہ ہوتا، تو انعام سے کوئی خوف کھلتے بغیر ایک سخور آدمی کی طرح تم سے پہلی بات ہی یہ کہتا کہ رذکی، مجھے تجھ سے محبت ہو گئی۔

مگر میں نے کہا: ”میں وقار بھائی سے ملنے آیا ہوں۔ میرانام صدیق احمد ہے“
تب تم چونکیں اور مسکراہٹ تھی جسے مجھ جیسے آدمی نے بھی ہونٹوں سے آنکھوں تک اور آنکھوں سے کافوں کی لووں تک سفر کرتے دیکھا۔

تب تم نے کہا تھا: ”ارے صدیق انکل؛ ڈھا کے والے؟“
میں نے اثبات میں جواب دیا تو تم بولیں: ”آداب صدیق انکل۔ میں عالیہ ہوں؛“
اور یہ کہ کہ تم وقار بھائی کو اطلاع دینے لان پر سے یوں تیرتی ہوتی سی گزر گئیں کہ مجھے تمارے بازوں پر پوں کا گمان ہونے لگا۔

پھر میں دیہی تماری کوٹھی کے ایک کرے میں رہنے لگا۔ آج یہ سڑیں بھی اسی کرے میں بیٹھا کھڑا ہوں۔ مائدہ بھی میں رہنے کا ارادہ ہے۔ اس کوٹھی کے کروں میں تماری آواز کی گونج بند ہے۔ میں اس کوٹھی کے چکتے دکتے فرش پر تمara ایک ایک نقش قدم گن سکتا ہوں۔ مجھے یہ تک معلوم ہے کہ تم کا بچ جانے کے لئے جسجا میرے کرے کے سامنے سے گزرتی ہو تو اپنی پکوں کو کتنا بار جھپکتی ہو۔ تمہیں بھی یہ معلوم نہ ہو گا کہ تمارے ایک کان کی دو کے قیچھے سوٹی کی نوک کے برابر ایک تل ہے۔ میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ اس لئے کہ میں نے تمہیں صرف دیکھا ہی نہیں ہے، میں نے تمہیں پڑھا ہے، میں نے تمہیں روٹ رکھا ہے۔

تم کہتی ہو گی صدیق انکل کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ تم یہ کبھی نہیں سوچو گی کہ تم نے صدیق انکل کا کیا کر دیا ہے۔ تم اپنے آپ کو مجھ سے اکیس بائیس برس کے فاصلے پر یا تو ہو اور میں تمیں بعض کی ایک دھمک کے فاصلے پر دیکھتا ہوں۔ قرب کا یہ تصور ان لوگوں کے نزدیک بے معنی ہو سکتا ہے جنہوں نے کبھی محبت نہ کی ہو۔ اور کی ہو، تو یونہی چلنٹ سی جیسے دودھ میں ابال آتا ہے، مگر تم یقیناً سمجھ جاؤ گی، یکونکہ تم نے محبت کی ہے۔ مجھ سے نہیں کی تو کیا ہوا۔ کسی سے تو محبت کی ہے۔

نظاہر یہ بہت شرم کی بات ہے کہ ایک آدمی جو ادھر غریب میں داخل ہو چکا ہے، ایک ایسی لڑکی سے محبت کرے جس نے بھر پور شباب میں ابھی قدم رکھا ہو۔ یقیناً نظاہر یہ بہت شرم کی بات ہے۔ پھر جب اس کی عمر لڑکی کے باپ کے برابر ہو اور جسے لڑکی "انکل" کہ کر پکارتی ہو، تو ایسی محبت شرمناک ہی کہلا سکتی ہے، مگر میں آج تمکے سامنے اپنی اس شرمناک محبت کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔

عالیہ، میں تم سے محبت کرتا ہوں؛ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے، مگر ہر بات کا سمجھ میں آجانا ضروری تو نہیں ہوتا۔ ہم خُدا کو نہیں سمجھتے، مگر اسے مانتے ہیں، تمیں ماننا ہو گا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ جواب میں تمیں مجھ پر محبت نہیں آتے گی، ترس آتے گا۔ غصہ بھی آسکنا تھا، مگر ضرف آج سے پھر نہیں پہلے جب تم نے محبت نہیں کی تھی۔ اب تو تم نے محبت کی ہے۔ اور جس طرح سادون کا بادل ٹوٹ کر برستا ہے، اسی طرح تم نے ٹوٹ کر محبت کی ہے اور جو محبت کرتا ہے اسے غصہ نہیں آتا۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ تمیں مجھ پر ترس آئے گا۔

تم میرے ایک عزیز دوست کی بیٹی ہو جو میرا محسن بھی ہے۔ مجھے تم سے محبت نہیں کرنا چاہیے تھی، مگر محبت قو زندگی اور موت کی طرح بے ساختہ چیز ہے۔ اس میں کسی کے ارادے کو کوئی دخل نہیں جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے، زندہ رہتا ہے اور مر

جاتا ہے، اسی طرح محبت کرنے لگتا ہے۔ بمحبی کو دمکھو، آخر مجھے کیا پڑی تھی کہ ایک نیک، ملیقہ شعار اور قبول صورت یہوی کا شوہر اور ساتھ ہی چھپسیارے پتوں کا باپ ہوتے ہوئے، میں پھیں، رس کے نوجوانوں کی طرح راتیں آنکھوں میں کاٹ دوں اور صبح کو بترے سے یوں ہلکا چدکا اٹھوں جیسے خوب گھری نیند سویا ہوں۔ اگر محبت کرنے میں نیت کا داخل ہوتا، تو میں تم سے محبت نہ کرتا۔ سو عالیہ! میں بالکل بے بس ہوں۔ سارا تصور تمہارا ہے کہ تم ناقابل برداشت حد تک خوبصورت ہو۔ جس طرح تم کہہ سکتی ہو کہ اگر میں خوبصورت ہوں تو اس میں میرا کیا تصور ہے، اسی طرح میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں نے تم سے محبت کی ہے تو اس میں میرا تصور کیا ہے۔

اس روز جب وقار بھائی تمہارے نے آتے ہوئے ایک پیغام کا مجھ سے ذکر کر رہے تھے، تو میں ان کی زبان سے یہ سُن کر دم بخود رہ گیا کہ تم میں صرف ایک کمی ہے اور وہ کمی یہ ہے کہ تم خوبصورت نہیں ہو۔ میرا جی چاہا۔ میں ان سے کہہ دوں کہ وقار بھائی، آپ کی بنیانی کب سے پھون گئی؟ آپ اندھے کب ہوئے؟ آپ کی آنکھیں کب پھوٹیں؟ یہ سب سوال میرے فہریں میں آتے، مگر ان سے نہ پوچھ سکتا تو بھی نہ پوچھتا۔ اس نے کہ اگر ایک بار میں تمہاری خوبصورتی کا ذکر شروع کر دیتا، تو پھر میری زبان کو میری موت ہی روک سکتی تھی۔ باپ کے سامنے بیٹی کے حُسن کی تعریف ہمارے معاشرے میں صرف دہی لوگ برداشت کرتے ہیں جو اس معاشرے کے معیاروں سے بہت نیچے گر جاتے ہیں یا بہت اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ اور میں اگر صرف تمہارے ہونٹوں کے حسن کا ذکر چھیر دوں، تو کیا ایک دن یا ایک سال یا ایک صدی میں بھی ان کے گوشوں میں دھڑکتی ہوئی مخصوصیت اور ان کے خطوط میں خم کھاتی ہوئی شوخی اور ان کے اچھوٹے پن کی بھکتی ہوئی شادابی کا جائزہ مکمل کر سکوں گا؟ تم نے کبھی اپنے ہونٹوں پر غوند کیا ہے عالیہ؟

تم اپنے آباجان کی نظر میں خوبصورت نہیں ہو۔ میں ہر معاشرے میں تمہارے آباجان پر رشک کرتا ہوں، مگر اس معاشرے میں مجھے ان کی ناکبھی پر رحم آتا ہے۔ انہیں شکایت ہتی کہ صرف تمہاری صورت کی وجہ سے تمہارے لئے اب تک کوئی اچھا پیغام نہیں آیا۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ مانگا تھا اور میں نے کہا تھا کہ عالیہ سے بھی تو مشورہ کر لیجئے۔ انہوں نے میری طرف حیران ہو کر دیکھا تھا اور کہا تھا: ”جی ہاں، زمانہ تو ایسا ہی آگیلہ ہے مگر عالیہ میری بیٹی ہے اور میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کے ذہن میں بی۔ اسے کامتحان امتیازی طور پر پاس کرنے کے سوا کوئی جذبہ نہیں ہے اور شادی کے معاشرے میں اس کی کوئی پسند ہو ہی نہیں سکتی۔“

میں یہ سن کر حیران رہ گیا تھا میں نے سوچا تھا کہ زمانہ ہزار ترقی کر جاتے اور علوم ہزار آگے ٹڑھ جائیں اور روایات ہزار ٹوٹیں، باپ سادہ لوح کے سادہ لوح ہی رہیں گے۔ وہ بیٹی کو صرف اسی خول میں دیکھ سکیں گے جس میں وہ ان کے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں سوچیں گے کہ انسانی جسم و ذہن کی ساخت ہر جگہ میساں ہے اور جذبہ قید نہیں ہو سکتا اور دُنیا کی ہر لڑکی کسی نہ کسی باپ کی بیٹی ہوتی ہے، مگر ہر باپ دوسرے کی لڑکی کے بارے میں جو کچھ سنتا، کہتا اور اندازے لگاتا ہے، وہ اپنی بیٹی کے بارے میں نہ سُن سکتا ہے، نہ کہ سکتا ہے، نہ اندازے لگا سکتا ہے۔ انسان بعض اوقات کتنا حماقت کی حد تک خود غرض نظر آتا ہے۔

جب میں نے ان پر زور دیا، تو وہ ماں لگتے، مگر اس شرط پر کہ تم سے اس پیغام کا ذکر مجھے کرنا ہو گا۔ یعنی میں جو تم سے محبت کرتا ہوں، تم سے پوچھنے کے لئے بھیجا جا رہا تھا کہ تم کس سے محبت کرتی ہو۔

جب تم کا بھ سے واپس آئیں، تو میں تمہارے پیچھے پیچھے ہو لیا اور جب تم نے اپنے کمرے میں جا کر پینگ پر اپنی کتابیں پھینکیں اور دوپٹہ اتار کر تیپانی کی طرف

اچھا دیا اور ایک اتنی لمبی انگوٹھائی کی کہیں جیران تھام نے اتنی دیر تک اپنی سانس کو کیسے روکتھا، تو میں نے تمارے دروازے کے پاس آکر اور ایک طرف ہو کر ہلکی سی دستک دی۔ تم نے پوچھا «کون؟»

اور مجھے تماری آواز کی وہ گونج یاد آگئی جو میں نے پہلے دن تمارے فرمائی تھی۔ تب میں نے سوچا کہ مجھے کچھ کہے بغیر دہان سے بھاگ جانا چاہیئے۔ اس کوٹھی سے، اس شر سے بھاگ جانا چاہیئے تاکہ وہ چھوٹوں جو میرے ذہن میں کھلا ہے مر جھلنے نہ پاتے۔

مگر چھترم باہر آگئیں اور تم نے کہا: «انکل!» اپھر تم میرے چہرے کا زنگ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ اس وقت میں نے تمارے چہرے کے آنکھیں میں اپنے چہرے کا زنگ دیکھ لیا تھا۔ «کیوں انکل!» تم نے کہا تھا۔ «آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟»

میں تمہیں کیسے بتائا کہ میں اپنی محنت کے کھنڈریں سے نکل کر تماری محنت کی تغیریں تمara ساختہ دینے آیا ہوں۔ میں فوراً تمارے گھرے میں چلا آیا اور میں نے جلدی جلدی سے بونا شروع کر دیا جیسے میں کوئی ادا کار ہوں اور اپنے رٹے ہوتے مکالے دو ہمارا رہا ہوں۔ «عالیہ تمہیں مجھ پر اعتماد ہے نا؟ تم اپنے انکل کو اپنا دوست بھی سمجھتی ہو نا؟»

اور تم نے کہا تھا: «دوست! میں تو آپ کو اپنے ابو کے برابر سمجھتی ہوں انکل!»

تب میرا زنگ کچھ اور اڑ گیا، کیونکہ تم چھرا کر میرے پاس بیٹھ گئیں اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جب تم نے میری آنکھوں میں فی کی تھر دیکھی تو تم بے قرار ہو گئیں اور تم نے کہا: «نہیں انکل! روئیے گا نہیں۔ پہلے مجھے بتائیے کہ بات کیا ہے۔ آپ اپنی بھیجنی کو اپنی دوست بھی سمجھتے ہیں نا؟ پھر مجھے بتلتے کیوں نہیں؟ کیا میں آپ کے کسی کام آسکتی ہوں انکل؟» تب تم نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور کہا: «میں دس تک لگتی ہوں۔ جب تک آپ نے آنسو پی لئے تو ٹھیک ہو دنہ پھر میں بھی روئے گوں گی۔ اول تو روئی نہیں ہوں،

لیکن اگر ورنے نکوں تو میرا پر دگرام بہت لمبا ہوتا ہے۔ لیجئے میں لگتی ہوں۔ ایک دو تین ٹکے
پھر تم رُک گئی تھیں کیونکہ میں تمہارے سر پر ہاتھ پھیر دھاتھا اور میں تمہاری ہی فتنم
کھا کر کھتا ہوں کہ یہ تمہارے انکل کا ہاتھ تھا۔ میرے دل میں تمہارے لئے مجتہت تھی اور
میرے ہاتھ میں تمہارے لئے شفقت تھی۔ تم کو گئی انسان ایک ہی لمحے میں اپنے آپ
کو دو شخصیتوں میں کیسے باٹ سکتا ہے اور میں کھتا ہوں کہ انسان اپنی ذات میں ایک
جہاں ہے اور اس جہاں میں پہاڑ اور جنگل، سمندر اور میدان، بادل اور ستارے، صحراء اور
دللیں، غرض کیا کچھ نہیں ہے!

یہ چند لمحے، جب تم میرے سینے پر اُسرد کھے ہوئے بیٹھی رہیں، میری مجتہت کا
سب سے بڑا انعام تھے۔ تم سے میرے سارے مطالبات اس نقطے پر یہ بخ کر ختم ہو
جاتے ہیں، کیونکہ اس کے بعد جب میں نے تمہیں بتایا کہ تمہارے لئے افضل کا پیغام آیا ہے
مگر تمہارے اباجان اس پیغام سے خوش نہیں ہیں تو تم تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔
پھر تم شرما کر بیٹھ گئی تھیں اور میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس رشتے کے بارے میں تمہاری
کیا راستے ہے۔

تم نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا تھا اور تم زار زار رونے لگی تھیں۔ اور تم نے میری
منہت کی تھی کہ میں کسی کو بتاؤں نہیں کہ تمہیں افضل سے بے پناہ مجتہت ہے۔ وہ قسم نے ہی فضل
سے کہا ہے کہ وہ تمہارے اباجان کو باقاعدہ پیغام بھجوائے اور اگر وہ انکھاں کر دیں،
تو تم دونوں انکھاں مر جاؤ۔

یہ چند لمحے جو تم نے اپنی مجتہت کے ذکر میں گزارے، میری مجتہت کی سب سے
بڑی مسترد اور سب سے کڑا کرب ہیں۔

عالیہ! میں نے تم سے مجتہت کی ہے نا۔ میں نے تم سے بڑی بھروسہ، بڑی
امتحانہ مجتہت کی ہے۔ یہ اسی مجتہت کا نتیجہ ہے کہ میں تمہاری خاطر تمہارے خاندان

سے لڑتا رہا ہوں۔

میں نے جب وقار بھائی کو بتایا کہ تمیں افضل کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو وہ آپ سے باہر ہو گئے اور تمیں بے نقط سنانے لگے۔ انہوں نے کہا کہ میں ہی جا کر تمیں بتاؤں کہ افضل ایک معمولی، یعنی خوبی خاندان کا ایک عام سلگو یا او سط درجے کا آدمی ہے، اور قم تین ہزار ماہانہ پانے والے ایک ایمیر آدمی کی بیٹی ہو اور تمیں متوسط طبقے کی رکھیوں کا ساکوئی جذباتی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے اور مستقبل کی ترازوں میں اپنا نفع نقصان مانتے اور رتی کی حد تک تول لینا چاہیے۔

یہ کتنی عجیب صورت حال تھی عالیہ! میں جو تم سے محبت کرتا ہوں، تمیں یہ کہنے کے لئے تمارے پاس بھیجا جائے تھا کہ تم جس سے محبت کرتی ہو، اس سے محبت کرنا چھوڑ دو! بھلا میں ایسا کیسے کہ سکتا تھا! میں نے محبت نہ کی تھی، تو شاید کہہ دیتا، مگر میں نے تو محبت کی تھی اور میری اس محبت کا تعاضا یہ تھا کہ میں تماری محبت کو حادثہ نہ بننے دوں۔ سو میں نے تم سے کہا تھا کہ وقار بھائی نہیں مانتے، مگر انہیں ماننا پڑے گا ورنہ انی بیٹی کے انکل سے بھی ہاتھ دھو لینے پڑیں گے۔ میں نے تمیں مشورہ دیا تھا کہ تم ثابت قدم رہو اور یہ ذمہ داری میں سنبھالتا ہوں کہ تمیں افضل کی بیوی بناؤ کر دم لوں گا۔

چیز نہ ہو عالیہ! محبت صرف انتقام لینا ہی تو نہیں سکھاتی۔ محبت تو دراصل محبت کرنا سکھاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب میں تمیں افضل سے محبت نہ جانے میں مددے رہا ہوں تو دراصل تم سے محبت کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم اس وقت میری حاقدت پر مسکرا رہی ہو، مگر عالیہ! حاقدت اور محبت میں تھوڑا سا فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہ سیقے کافر قہ ہے اور اس سے تمیں بھی انکار نہیں ہونا چاہیے کہ اگرچہ میں نے تم سے احتمانہ محبت کی ہے، مگر بڑے سیقے کی محبت کی ہے کہتی دلوں اور جھگٹاؤں اور بخنوں کے بعد آج وقار بھائی مان گئے ہیں۔ مجھے

چاہیے تھا کہ تمیں یہ خوشخبری فوراً پہنچانا، مگر پھر میں نے سوچا کہ پہلے تمارے نام
یہ خط لکھ دوں۔ دراصل آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میں نے تم سے اپنی محبت
انتہا تک بھادی ہے۔ میری سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ تمیں خوش دیکھ سکوں۔
لوگ اسے محبت کا امتحان کسیں گے، میں اسے محبت کی پہچان کرتا ہوں۔

عالیہ! میں نے تمیں حاصل کرنے کے لئے تو تم سے محبت نہیں کی تھی۔ میں نے
تو تم سے خالی خوبی محبت کی۔ صرف اس لئے کہ تم ناقابلِ یقین حد تک خوبصورت ہو۔
اور اس لئے کہ تمہاری آواز کی طرح تمہاری ساری شخصیت میں ایک گونج سی ہے۔ کبھی
ایک لمحے کے لئے بھی میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ تم میری ہوتیں۔ میں ایسا سوچتا
تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ میں تم سے محبت نہیں کر رہا ہوں، دشمنی کر رہا ہوں۔ سو افضل
کے ساتھ تمہارے چلنے کے بعد مجھے مخدومی کا احساس قطعی نہیں تلتے گا۔ جب میں
تمارے ساتھ محبت کرنے جاؤں گا تو مخدومی کیسی؟